فقہیات سیرت

ڈاکٹر محمود احمد غازی

بظاہر فقہ اور سیرت دونوں الگ الگ موضوعات اور مضامین سمجھے جاتے ہیں۔ فقہ کا دائرہ کار قانون اور شریعت کے اصول ہیں۔ سیرت کا دائرہ کار عموماً تاریخ اور رسول اکرم ﷺ کی سوانح عمری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ فقہ سے مراد ایک گہری اور عمیق فہم اور profound understanding ہے۔ یعنی قرآن پاک کے احکام، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت مبارکہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ کی گہری فہم۔ جب تک ان تینوں چیزوں کی گہری فہم حاصل نہ ہو، جب تک ان تینوں مصادر ہدایت میں گہری بصیرت حاصل نہ ہو، اس وقت تک شریعت کے قوانین اور احکام پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے فقہ اور سیرت میں انتہائی گہرا اور قریبی ربط پایا جاتا ہے۔ سیرت سے واقفیت شریعت کے بہت سے احکام کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ شریعت کے بہت سے احکام کی تفسیر جانے بغیر سیرت کی نزاکتوں اور حکمتوں کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ ایک اعتبار سے سیرت ہی سے عملی تطبیق کا نام فقہ ہے۔ اور فقہ سیرت ہی کی گہری فہم کا نام ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ فقہ کی اصطلاح بہت عمومی، جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے دین اور آپ کی عطا فرمودہ شریعت کے ہر ہر پہلو کی گہری فہم، ادراک اور بصیرت کو فقہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ چنانچہ آج جس کو علم کلام یا عقیدہ کہتے ہیں وہ بھی ایک زمانے میں فقہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے الفقہ الاکبر کے نام سے جو کتاب منسوب ہے، اس میں فقہ اکبر کی اصطلاح اسلامی عقائد کی گہری فہم، دین کے بنیادی اصول اور عقائد کے گہرے ادراک کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ بعد کی صدیوں میں بھی فقہ کی اصطلاح کا استعمال ایک عمومی بصیرت کے معنوں میں ہوتا رہا ہے۔ فقہ النفس انسانی نفسیات کی گہری واقفیت کے لئے بہت سے حضرات نے استعمال کیا۔ بہت سے اکابر اسلام کے لئے فقیہ النفس کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یعنی وہ اکابر، وہ

صاحب بصیرت شخصیات جن کو انسانی مزاج اور نفسیات کے ادراک میں غیر معمولی بصیرت حاصل تھی۔ ان کو فقیہ النفس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

آج بھی، خاص طور پر بیسویں صدی کی ابتدا سے فقہ السیرۃ کے نام سے مطالعہ سیرت کا ایک نیا انداز سامنے آیا ہے۔ اس کا مقصد محض سیرت کے واقعات بیان کرنا نہیں ہے۔ محض سیرت کی تاریخی تفصیلات سے اعتنا کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ سیرت کے ان تاریخی واقعات اور تفصیلات میں جو سبق پنہاں ہے اس کو نمایاں کیا جائے۔ جو بصیرتیں اور حکمتیں سیرت پاک کے واقعات میں پوشیدہ ہیں ان کو سامنے لایا جائے۔ اس کاوش کا نام بہت سے حضرات نے فقہ السیرۃ رکھا ہے، جس کا تذکرہ دور جدید میں مطالعہ سیرت کے عنوان سے ہونے والی گفتگو میں ان شاء اللہ کیا جائے گا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ فقہ اور سیرت ان دونوں کے درمیان موجود ربط بہت قدیم اور گہرا ہے۔ ایک کو سمجھے بغیر دوسرے کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

فقہیات سیرت کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ فقہیات سیرت کا ایک حصہ تو وہ اصول اور قواعد ہیں جو اکابر اسلام نے خود احادیث اور سیرت کی روشنی میں متعین فرمائے ہیں، جن کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، احادیث مبارکہ اور سیرت کے واقعات کو نہ صرف سمجھا جانا چاہئے بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں ان احکام کی تطبیق اور موجودہ دور کے واقعات اور مسائل و احکام کا تعین کیا جانا چاہئے۔ یہ بڑے بڑے اصول صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے زیر غور آرہے ہیں۔ ان پر فقہائے اسلام نے اور شریعت کے ماہرین نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ فقہیات سیرت کا دوسرا بڑا میدان وہ واقعات یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ ارشادات ہیں جن کی فقہی تعبیر کے بغیر، یعنی ان کو فقہی نقطہ نظر سے سمجھے بغیر سیرت کے ان احکام کی تعبیر کرنا بہت مشکل ہے۔ اس سلسلے میں حج کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب حج ادا فرمایا، اس کو ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد صحابہ کرام نے دیکھا۔ اس کی تفصیلات تابعین کو پہنچائیں۔ لیکن دیکھنے والوں کی اس کثرت کے باوجود، راویوں کے اس عظیم الشان جم غفیر کے باوجود، یہ بات مختلف فیہ رہی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حج فرمایا تھا، وہ حج قران تھا، حج تمتع تھا یا حج افراد تھا۔ تینوں صورتوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ اب ان تینوں میں کون سی قسم سنت کے زیادہ قریب ہے، کون سی قسم افضل ہے؟ یہ فقہ کا مسئلہ بھی ہے اور

سیرت کا مسئلہ بھی۔

رسول اللہ ﷺ کے حج کی تفصیلات کے لئے فقہی احکام جاننا ضروری ہے۔ اس طرح فقہی احکام جاننے کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حج کی تفصیلات جاننا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع دن سے فقہائے اسلام، محدثین اور ارباب سیرت سب رسول اللہ ﷺ کے حج سے متعلق احادیث اور تفصیلات کو جمع کرنے، ان پر غور وحوض کرنے، ان سے نئے نئے نتائج اور مسائل کا استنباط اور استدلال کرنے میں مصروف رہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں۔ ہر محدث نے، ہر فقیہ اور ہر سیرت نگار نے رسول اللہ ﷺ کے اس حج کی تفصیلات کو ایک نئے انداز سے جمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ فقہیات سیرت کا دوسرا میدان ہے۔

۳۔ فقہیات سیرت کا تیسرا بڑا میدان بہت دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے مختلف ارشادات اور فیصلوں کو فقہائے اسلام نے مختلف زمروں میں مرتب کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اولین اور سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کی مرضی کے ترجمان ہیں۔ حامل وحی ہیں اور آخری شریعت کے عطا فرمانے والے ہیں۔ اس لئے حضور نے جو کچھ فرمایا وہ اللہ کی رہنمائی میں فرمایا۔

وماینطق عن الھویٰ ان ھو الاّ وحی یوحی (۱)

وہ کوئی لفظ اپنی زبان سے خواہش نفس کے داعیے سے نہیں نکالتے، بلکہ جو کچھ بولتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے۔

اس کے باوجود کہ جو کچھ حضور فرماتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارکہ سے بہت سے وہ الفاظ بھی نکلتے تھے جو انسانوں کے مابین عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ صحابہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہماری مجلس میں تشریف لاتے تھے، اور ہمیں دیکھتے تھے کہ ہم شعروشاعری کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں تو آپ ہماری گفتگو میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ آپ دیکھتے تھے کہ ہم پرانے واقعات اور ایام العرب کو بیان کر رہے ہیں تو آپ اس میں بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کسی کے ذوق، مزاج اور کسی کے انداز کو زبردستی بدلنے کی اور ایک مصنوعی یا متعصبانہ مذہبیت کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حضور کی محفل میں لوگ خود بخود اس رنگ میں رنگ جایا کرتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کا رنگ تھا۔

لیکن اگر کوئی بات آپ ﷺ نے ایسی ارشاد فرمائی جو خاص اُس ماحول یا اُس زمانے کے لحاظ سے تھی تو اس کی شرعی حیثیت یا درجے کے بارے میں اہل علم میں گفتگو رہی ہے۔ عرب میں بہت سے واقعات، ضرب الامثال، قصے کہانیاں اور تفریح طبع کے کئی قصے رائج تھے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کی دل جوئی کی خاطر ان میں بھی شرکت فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح کے مواقع پر حضور نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ بھی شریعت کا اسی طرح حصہ ہے جیسے شریعت کا حصہ وہ احادیث ہیں جن سے سنت ثابت ہوتی ہے۔ اس موضوع پر فقہائے اسلام نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور عموماً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کہ حضور کے کون کون سے ارشادات وہ ہیں جو ماخذ ومصادر شریعت ہیں، اور کون کون سے ارشادات گرامی وہ ہیں جو آپ نے بطور ایک عام انسان کے ارشاد فرمائے۔ جو کچھ آپ نے بطور ایک انسان ارشاد فرمایا، اس میں بھی شریعت کا ایک پہلو موجود ہے۔ اس سے بھی شریعت کے بہت سے احکام نکلتے ہیں اس لئے شریعت کے عمومی دائرے سے اور عمومی حدود سے کوئی چیز خارج نہیں ہوسکتی۔

اس حد تک تو کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ لیکن جہاں بحث وتمحیص کی زیادہ گنجائش ہے یہ وہ معاملات ہیں جہاں فقہائے اسلام اور محدثین قطعیت اور اتفاق رائے سے یہ تعین نہیں کر پائے کہ رسول اللہ ﷺ کی کون سی بات بطور نبی اور رسول کے ارشاد فرمائی گئی اور کون سی بات آپ نے بطور سربراہ ریاست اور قاضی کے ارشاد فرمائی۔ جو چیز آپ نے بطور قاضی کے ارشاد فرمائی، اس کا دائرہ محدود ہے۔ قانون دان حضرات مجھ سے بہتر اس بات کو جانتے ہیں کہ قانون کی اصطلاح میں ایک معاملہ ہوتا ہے in personen، ایک معاملہ ہوتا ہے in-rem۔ جو بات آپ نے نبی اور رسول کے طور پر ارشاد فرمائی وہ in rem یعنی تمام انسانوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ جو فیصلہ آپ نے بطور قاضی کے فرمایا وہ in persone یعنی ان دو فریقوں کے لئے واجب التعمیل ہے جن کا مقدمہ درپیش تھا۔ آپ نے کسی جائداد کی ملکیت کا فیصلہ ایک شخص کے حق میں کیا۔ دوسرے صاحب کے حق میں کسی اور حق کا فیصلہ کیا۔ اب یہ فیصلہ صرف ان دونوں کے لئے ہوا ہے اور انہی دونوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ بقیہ لوگوں کا اس کے مندرجات یا لین دین سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض مواقع ایسے آئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی معاملے میں رہنمائی فرمائی۔ بعد میں محدثین اور فقہا نے اس کی جزئیات اور نزاکتوں پر غور کیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ بات آپ نے کس حیثیت میں ارشاد فرمائی تھی۔ اگر بطور نبی کے ارشاد فرمائی تو اس کے

تضمنات اور implications اور ہیں۔ اگر بطور سربراہ حکومت کے ارشاد فرمائی تو اس کے تضمنات اور نتائج اور ہیں۔ اگر بطور قاضی کے ارشاد فرمائی تو اس کے تضمنات اور ہیں۔ اس بارے میں فقہا میں اختلاف بھی ہوا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا تعلق فقہیات سیرت سے ہے۔ اگر ان سب واقعات و مسائل کو جمع کیا جائے تو ان سب کا ایک عمومی عنوان فقہیات سیرت ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

قبل اس سے کہ ہم آگے بڑھیں، ایک بہت اہم ارشاد گرامی کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، ایسا ارشاد گرامی جو محدثین، ارباب سیرت اور فقہائے اسلام کے درمیان ایک طویل بحث کا موضوع رہا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انصاری صحابہ کرام کی بڑی تعداد زراعت سے وابستہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں زراعت کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ وادی غیر ذی زرع کہلاتا تھا۔ گھاس کی پتی بھی نہیں اگتی تھی۔ اس لئے اہل مکہ کو زراعت سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ انہیں نہ زراعت کے تقاضوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اس کو جانتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں تشریف لا کر دیکھا کہ جو لوگ کھجور کی زراعت کا کاروبار کرتے ہیں وہ کھجور کے دو پودوں میں قلم لگاتے ہیں اور ان کی تقسیم نر اور مادہ پودوں میں کرتے ہیں۔ بادی النظر میں آپ ﷺ کو یہ چیز نامناسب معلوم ہوئی۔ آپ نے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ صحابہ کرام تو حضور کے ہر اشارے کو حکم سمجھتے تھے۔ انہوں نے قلم لگانے کا یہ عمل جس کو عربی میں تأبیر نخل کہتے ہیں، نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن جن حضرات نے تأبیر نخل کا یہ عمل نہیں کیا ان کے ہاں پیداوار بہت کم ہوئی۔ جن کی پیداوار کم ہوئی انہوں نے احتراماً اور عقیدتاً یہ بات حضور کے سامنے بیان نہیں کی۔ لیکن بعض نوجوانوں نے آکر یہ پوچھا کہ یارسول اللہ آپ نے تأبیر نخل سے منع فرمایا تھا۔ تأبیر نخل نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں پیداوار بہت کم ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا ہی ہے؟ اس پر بڑے بڑے صحابہ کرام جو وسیع رقبے پر زراعت کر رہے تھے انہوں نے تصدیق کی کہ یارسول اللہ ایسا ہی ہوا ہے۔ آپ نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے۔ اب صحابہ نے وضاحت کی کہ کھجور کے بعض پودے بارآور ہوتے ہیں اور بعض بارآور نہیں ہوتے۔ جو بارآور ہوتے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کا قلم دوسرے پودے میں لگایا جائے اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ غیر بارآور پودے میں جو اجزا کم ہوتے ہیں وہ دوسرے پودے سے پورے ہو جاتے ہیں اور اس میں پھل لگ جاتا ہے۔ یہ ایک فنی چیز ہے اور زراعت کی دنیا میں ہر ایک کو معلوم ہے۔

اس پر آپ نے وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا جو یہاں پیش کرنا مقصود ہے، آپ نے فرمایا:

انتم اعلم بامور دنیاکم (۲)

تم اپنے دنیاوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ جب میں شریعت یا دین کی کوئی بات تم سے کہوں تو وہ تمہارے لئے واجب التعمیل ہے۔ اگر دنیاوی معاملے میں کوئی مشورہ دوں تو اس پر دنیاوی مصلحتوں اور حکمتوں کے مطابق غور کرو اور جو حکمت اور مصلحت کا تقاضا ہو اس کے مطابق عمل کرو۔

تأبیر نخل کی یہ روایت تمام بڑے بڑے محدثین نے بیان کی ہے۔ اس پر بڑی تفصیلی بحثیں ہوئی ہیں۔ اصولی حد تک تو یہ بات مختلف فیہ نہیں ہے۔ چونکہ یہ بات خود سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہے اس لئے سب فقہا اور محدثین اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ البتہ یہ بات کہ کون سی بات جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمائی وہ دنیاوی معاملات میں مشورے کے مترادف ہے اور شریعت کا حکم نہیں ہے، اس کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔

بعض صحابہ کرام ایسے بھی تھے جو عشق رسول کی انتہا پر تھے۔ وہ یہ سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ کون سی بات آپ نے بطور انسان ایک مشورے کے طور پر فرمائی ہے اور کون سی بات بطور نبی ہدایت ربانی کے طور پر فرمائی ہے۔ صحابہ کرام تو لفظ اور اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کچھ صحابہ مسجد نبوی کے اندر کھڑے تھے اور نماز وغیرہ کی تیاری کر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے دوران خطبہ ارشاد فرمایا کہ جو کھڑے ہیں وہ بیٹھ جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں کئی ایسے صحابہ بھی بیٹھ گئے جو ابھی گلی میں تھے اور مسجد میں داخل نہیں ہوئے تھے، وہ گلی ہی میں بیٹھ گئے۔ بعد میں حضور نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں بیٹھ گئے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ یا رسول اللہ آپ کی زبان مبارک سے بیٹھ جانے کا حکم سننے کے باوجود کیسے نہ بیٹھتے۔ حضور ﷺ نے اس پر ان کے لئے برکت کی دعا کی اور ان کے اس عمل کو ناپسند نہیں فرمایا۔ تو صحابہ کرام میں تو ایسے عشاق اور فدا کار بھی تھے جو یہ سوچنا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ حضور کی کون سی بات بحیثیت انسان کے عام بات ہے اور کون سی بات بطور نبی کے ایک ہدایت ہے۔ انہوں نے تو جو کچھ زبان مبارک سے نکلا اس پر اسی وقت عمل کر لیا۔

بعد میں جب فقہی احکام کو مرتب کرنے کا مرحلہ آیا اور فقہا نے ایک ایک چیز کو الگ الگ منقح کیا کہ کیا فرض ہے، کیا واجب ہے، کیا مندوب ہے، کیا مستحب ہے اور کیا جائز ہے تو پھر اس سوال کا جواب پانا ناگزیر ہو گیا کہ ہر چیز کے بارے میں الگ الگ حکم متعین کیا جائے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات میں بھی جو شرعی رہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں بعض احکام و ہدایات کی حیثیت فرض اور واجب کی ہے۔ بعض

ارشادات میں کسی چیز کے مستحب یا مندوب ہونے کا بیان ہے۔ بعض کا منشا محض کسی چیز کے جائز ہونے کا بتانا تھا۔ بعض ارشادات کے ذریعے حضور کوئی غلط فہمی دور کرانا چاہتے تھے کہ یہ کام کر سکتے ہو، یہ جائز ہے۔ مثلاً بعض صحابہ کرام بیماری کے دوران علاج کرانے اور دوا استعمال کرنے کو خلاف توکل سمجھنے لگے۔ ایمان اور اللہ پر بھروسے کی ایک معراج یہ بھی تھی کہ انہوں نے سمجھا کہ اگر بیماری اللہ نے آزمائش کے لئے اتاری ہے تو میں علاج کیوں کروں۔ یہ ایک نیا عاشقانہ انداز ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

یاعباداللہ تداووا (۳)

اللہ کے بندو! علاج کیا کرو۔

اب یہ بات فرض اور واجب کی نہیں۔ بلکہ ایک چیز کو ناپسندیدہ یا مکروہ سمجھا گیا۔ توکل اور تقویٰ کے اعلیٰ مقام اور مرتبے کے منافی سمجھا گیا اس لئے آپ نے وضاحت فرمادی کہ علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ کرنا چاہئے۔ اس لئے یہاں جو حکم ہے وہ فرضیت اور وجوب کے لئے نہیں ہے، بلکہ جواز کے لئے ہے کہ اس کو جواز کے درجے میں سمجھنا چاہئے یا مستحب کے درجہ میں۔

صحابہ کرام کے زمانے میں تو یہ مسئلہ پیش نہیں آیا۔ لیکن فقہا نے جب یہ سوال اٹھایا تو پھر کئی جگہ ایسے سوالات پیدا ہوئے۔ اکثر و بیشتر معاملات میں یہ بات واضح تھی کہ کون سی بات آپ نے بطور مشورہ کے دنیاوی معاملات میں ارشاد فرمائی ہے، اور کون سی بات آپ نے ایک شرعی رہنمائی کے طور پر ارشاد فرمائی ہے۔ ایک دو معاملات میں یہ سوال پیدا ہوا۔ شاید وہ احادیث آٹھ دس سے زیادہ نہ ہوں جہاں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ یہ جو بات ارشاد فرمائی گئی یہ کس نوعیت کی ہے۔ اور پھر اس بات کی نوعیت کا تعین کرنے میں فقہا میں مختلف رائیں پیدا ہوئیں۔ میں مثالیں دے کر ابھی اس کو واضح کروں گا۔

لیکن اس پر آگے بڑھنے سے پہلے اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو باتیں بطور نبی اور شرعی ہدایت کے ارشاد فرمائیں ان کا تعلق عموماً غیبیات اور شرعیات سے ہے، یعنی ان معاملات اور عقائد سے جو عام انسان کی نظروں سے اوجھل ہیں، یا جن کے بارے میں خالص انسانی تجربے اور عقل سے کوئی حتمی اور قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کی اللہ کے رسول نے خبر دی۔ یعنی عقائد، مکارم اخلاق، عبادات اور حلال وحرام۔ ان چار چیزوں سے جن امور کا تعلق ہے وہ تو سو فیصد شرعی رہنمائی اور ہدایت کے معاملات ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقائد اور عبادات کے بارے میں کوئی بات مشورتاً ارشاد نہیں فرمائی۔ وہ سب پیغمبرانہ ہدایت اور رہنمائی ہے۔ عبادات اور مکارم اخلاق کے

بارے میں جو کچھ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ شرعی ہدایت اور رہنمائی ہے۔

دو معاملات ایسے ہیں جہاں اس بات کی گنجائش ہے کہ آپ نے جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بطور ایک عام انسانی مشورے کے ارشاد فرمائی ہو۔ ایک کا تعلق عام انسانی رہن سہن اور عادات سے ہے۔ دوسرے کا تعلق معاملات سے ہے۔ انسانوں کے درمیان لین دین اور تجارت کے معاملے میں شریعت کا مزاج یا حکمت یہ ہے شریعت رائج الوقت معاملات یا تصورات کو سو فیصد ختم نہیں کرتی۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے بھی اپنے زمانے کے رائج الوقت کاروباری طریقوں کو مکمل طور پر منع نہیں فرمایا۔ کاروبار کے وہ طریقے جو کسی پہلو سے کسی ناجائز عنصر پر مشتمل تھے، اس ناجائز عنصر کو آپ نے منع فرما دیا۔ اس طرح سے کاروبار اور تجارت کے تمام منفی پہلوؤں کی نشاندہی فرما کر بقیہ حصوں کو آپ ﷺ نے اسی طرح جاری رہنے دیا۔ یہ مضاربہ اور مشارکہ اور دوسرے متعدد کاروبار سب اسلام سے پہلے سے رائج تھے۔ مضاربہ کو اگر ہم اسلامی طریقہ کار کہتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ قرآن پاک نے کہیں مضاربہ کا حکم دیا ہے یا حدیث میں آیا ہے کہ اے مسلمانو مضاربہ کیا کرو۔ بلکہ یہ طریقہ عربوں میں اسلام سے پہلے سے رائج تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے نبوت سے پندرہ بیس سال قبل حضرت خدیجہ کا مال لے کر مضاربہ فرمایا۔ یہ طریقہ کار عرب میں رائج تھا۔ دنیا میں ہر جگہ sleeping partners کا سسٹم رائج ہے۔

ان معاملات میں جو چیز شریعت سے متعارض تھی اور جن غیر اسلامی عناصر کی آمیزش تھی ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرما دی اور جو پہلو جائز تھے ان کی آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ یوں تجارت اور کاروبار میں جائز اور ناجائز دونوں کو حضور نے الگ کر کے بیان فرما دیا۔ اس لئے معاملات کی حد تک شریعت کا منشا یہ تھا کہ معاملات میں جو ناجائز یا غلط پہلو ہیں ان کی اصلاح کر دی جائے اور بقیہ پہلوؤں کو جاری رکھا جائے۔ اس لئے معاملات میں اس سوال کی قدر بے گنجائش تھی کہ حضور ﷺ کا کوئی ارشاد بطور مشورے کے ہے یا بطور شرعی رہنمائی کے ہے۔ حضور ﷺ خود اپنے زمانے کے کامیاب ترین تاجر تھے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام تجارتی سامان لے کر بارہا ایک علاقے سے دوسرے علاقے تشریف لے گئے۔ نبوت سے پہلے آپ ﷺ نے کئی تجارتی سفر فرمائے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جزیرہ عرب کے مشرق میں جو بڑی بڑی بندرگاہیں تھیں جہاں چین اور ہندوستان سے مال آتا تھا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام وہاں بھی تشریف لے گئے اور چینی اور ہندوستانی تاجروں سے ملاقات ہوئی۔

ہمارے جاٹ بھائیوں کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ ان تجارتی سفروں کے دوران جاٹوں

سے بھی رسول اللہ ﷺ کی ملاقات ہوئی۔ اس کی ایک دلچسپ دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معراج کے سفر میں مختلف انبیا سے ملاقات کی تو مختلف انبیا کا حلیہ بھی بیان فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ بیان فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ انہیں دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے ہندوستان کے جاٹ ہوتے ہیں۔ طویل قامت، پختہ قد، ورزشی جسم اور کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ اس طرح آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد وقامت اور جسمانی ساخت کو ہندوستان کے جاٹوں سے تشبیہ دی۔

اب محدثین نے اس پر بحث کی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جاٹوں کی ساخت اور قد وقامت کا علم کہاں سے ہوا۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ نے اپنے تجارتی اسفار میں ہندوستان سے آنے والے تاجروں سے معاملہ کیا ہوگا۔ ان کے ساتھ تجارت بھی کی ہوگی۔ اسی طرح چین سے بھی حضور کی واقفیت انہی تاجروں کے ذریعے ہوئی جو یہاں آیا کرتے تھے۔ اب اگر تجارت کے معاملے میں حضور ﷺ کوئی بات کسی سے ارشاد فرمائیں تو اس میں دونوں امکان موجود ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ایک تجربہ کار بزرگ تاجر کی حیثیت سے کسی نوجوان اور نووارد تاجر کو مشورہ دے رہے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بطور نبی اور پیغمبر کے رہنمائی ارشاد فرما رہے ہوں۔

اسی طرح سے عادات میں یعنی قوموں کے عام رہن سہن کے طریقہ کار میں، لوگوں کے میل جول کے انداز میں، کھانے پینے اور لباس میں ہر علاقے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہر علاقہ کا لباس اس کی آب وہوا اور موسم کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر علاقے کا کھانے پینے کا طریقہ اس علاقے کی پیداوار اور موسم کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے کبھی ان چیزوں میں مداخلت نہیں کی۔ یہ نہیں کہا کہ فلاں علاقے کے لوگو! فلاں چیز کھانا چھوڑ دو۔ یا فلاں چیز کھایا کرو۔ یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے، نہ اسلام اس کام کے لئے آیا ہے۔ البتہ کھانے پینے کے طور طریقوں اور لباس میں جو چیز ناجائز تھی وہ آپ نے کھل کر بیان کردی اور بتادیا کہ یہ ناجائز ہے باقی چیزیں جائز ہیں۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کے جو احکام آداب اور عادات کے باب میں ہیں ان میں شریعت نے انسانوں کو بہت آزادی دی ہے اور مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مباحات کے اس وسیع دائرے ہی کی وجہ سے فقہا کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ جو بات آپ نے ارشاد فرمائی ہے وہ مباحات کے اس دائرے میں ایک مشورہ ہے یا علت وحرمت کا کوئی سوال ہے، یہ ایک ایسا میدان ہے کہ یہاں غلط فہمیوں کا امکان بھی ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں انسان کے غلط فہمی کا شکار ہونے کا امکان تھا وہاں حضور نے اس

کا راستہ بند کر دیا۔ مکارم اخلاق انسانوں میں مشترک رہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے ہر دور میں مکارم اخلاق کی تعلیم دی ہے۔ ہر پیغمبر نے بداخلاقی سے روکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف ان مکارم اخلاق کو برقرار رکھا جو انبیا علیہم السلام کی تعلیم کے بقایا جات کے طور پر چلے آ رہے تھے۔ بلکہ ان کی تکمیل فرمائی۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (۴)

میں اس کام کے لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

گویا جو مکارم اخلاق پہلے سے آ رہے تھے ان کو برقرار رکھوں، ان کی مزید وضاحت کروں اور ان میں جہاں جہاں کمی یا خامی ہے اس کو پورا کر کے اپنے ماننے والوں کو مکارم اخلاق کا ایک پورا نظام دے دوں۔ مکارم اخلاق میں جہاں جہاں انسانی عقل سے غلطی کا امکان تھا وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضاحت فرما دی۔ جہاں مکارم اخلاق میں ماضی کے کسی فرد یا قوم کی وجہ سے کوئی غلطی پیدا ہو گئی تھی اس کو آپ نے دور فرما دیا۔ اس اعتبار سے جو اختلافی مباحث ہیں وہ عموماً آداب اور معاملات کے میدان میں ہیں۔ مکارم اخلاق، عقائد اور عبادات میں ایسے اختلافی امور نہ ہونے کے برابر ہیں۔

فقہیات سیرت کا ایک پہلو اور بھی ہے جو ان تینوں پہلوؤں سے مختلف ہے اور براہ راست سیرت کا حصہ بھی ہے اور حکمت تشریع کا حصہ بھی ہے۔ حکمت تشریع سے مراد یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں جو ایک متکامل نظام قانون دیا گیا ہے اس کی بنیادی حکمت اور بنیادی تصورات کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے تمام احکام ایک حکمت پر مبنی ہیں۔ شریعت کے کچھ بنیادی مقاصد ہیں جن کے حصول کے لئے کچھ احکام دیئے گئے ہیں۔ ان احکام پر عمل درآمد کو آسان بنانے کے لئے بعض مزید دلائل دیئے گئے ہیں۔ اس لئے شریعت کے سارے احکام اس کے بنیادی مقصد یا مقاصد سے وابستہ ہیں۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ بنی نوع انسان کی تاریخ کے مقنن اعظم بھی ہیں۔ بنی نوع انسان کی تاریخ کے مقنن اعظم ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ نے قانون کی بنیادیں بھی عطا فرمائیں۔ قانون کے وہ اعلیٰ تصورات بھی عطا فرمائے جن کو آج مغرب میں meta-jurisprudence کہتے ہیں۔ ایک تو jurisprudence یا اصول قانون کے قواعد ہیں یعنی قانون کا بنیادی اور منظم مطالعہ اور اس کے اصول۔ لیکن اس منظم مطالعے کے لئے کچھ اعلیٰ اور برتر اخلاقی بنیادیں درکار ہیں جن کو meta-jurisprudence کہا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے دور میں meta-jurisprudence کے اصول عطا فرمائے۔ وہ higher

moral ideals یا برتر اخلاقی معیارات عطا فرمائے جن کی بنیاد پر مقاصد شریعت کی وضاحت ہوئی۔ مقاصد شریعت اور مصادر شریعت وہ jurisprudence ہیں جن کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے تفصیلی احکام مرتب فرمائے۔

جتنے بھی قوانین دنیا میں اس وقت رائج ہیں یا ماضی میں رائج رہے ہیں، یہودیوں کے قدیم قوانین اور ہندوؤں کے منوشاستر سے لے کر، اور حمورابی کے قانون اور جسٹینین کے کوڈ سے لے کر آج کے تازہ ترین مغربی قوانین تک، ان سب قوانین میں ایک چیز قدر مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان قوانین کے جو اصول قانون ہیں وہ ایک طویل عرصے کے بعد سامنے آئے۔ اس کے برعکس اسلامی فقہ کی تاریخ میں قانون اور اصول قانون اور ماورائے اصول قانون سب قریب قریب ایک ساتھ ہی ظہور پذیر ہوئے۔ دسرے قانونی نظاموں میں اصول قانون کا تصور ایک ایک ہزار اور ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار سال کے بعد پیدا ہوا۔ رومن لا میں کہیں کہیں ڈیڑھ ہزار سال بعد یہ تصور سامنے آیا۔ اس کوڈ کی تدوین سے کوئی نو سو سال پہلے سے، بلکہ ایک ہزار سال پہلے سے رومن لا چلا آ رہا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بہت پہلے سے رومن لا چلا آ رہا تھا اور قانون روما کے احکام اور مجموعے لکھے ہوئے موجود تھے۔ لیکن چونکہ جسٹینین نے ان سب کو ایک جگہ جمع کرا کر ایک بڑا مجموعہ مرتب کروایا تھا۔ اس لئے جسٹینین کی حیثیت ایک بڑے مقنن کی سمجھی جاتی ہے۔ جسٹینین روما کا حکمران تھا اور جب اس کا انتقال ہوتو رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک غالباً چھ سات سال تھی۔ حضور کے بہت بچپن کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔ جناب عبدالمطلب ابھی حیات تھے جب جسٹینین دنیا سے رخصت ہوا۔

لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس اہم کام میں جسٹینین کا اپنا کوئی ذاتی کارنامہ نہیں ہے۔ اس کام میں اپنا ذاتی کارنامہ اس لئے نہیں ہے کہ یہ سارے قوانین پہلے سے موجود تھے۔ ایک ہزار برس سے ان پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔ ان کے کئی تحریری مجموعے موجود تھے۔ جسٹینین نے کچھ لوگوں سے کہا اور انہوں نے تمام قوانین کو جمع کر کے ان کی ایک جامع کتاب مرتب کر دی۔ زیادہ سے زیادہ اس کارنامے کو اورنگزیب عالمگیر کے فتاویٰ عالمگیری کے برابر کا کارنامہ قرار دے سکتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے کہنے پر تقریباً دو سے فقہا نے بیٹھ کر فتاوی عالمگیری مرتب کر دی۔ اس میں اورنگ زیب کا صرف اتنا کارنامہ ہے کہ اس کے حکم سے یہ کام ہوا۔ اس کا کارنامہ سوائے اس کی دلچسپی کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہی جسٹینین کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے از سر نو بنیادی تصورات عطا فرمائے۔ بنیادی تصورات کے بعد جب

نظام عطا فرمایا تو اس کے قواعد اور اساسات عطا فرمائے۔ پھر ان اساسات کی بنیاد پر ایک مکمل اور elaborate legal system آپ نے عطا فرمایا۔ پھر اس لیگل سسٹم پر بے شمار لوگوں نے غور کیا ہے۔

دنیا کے قانونی نظاموں اور تصورات پر غور کرنے والوں اور کتابیں لکھنے والوں نے نظری کام تو بہت کیا ہے۔ لیکن آج تک کوئی ایسا قانون دان انسان کی معلوم تاریخ میں روئے زمین پر نہیں ہوا ہے جس نے خود قانون کا کوئی تصور دیا ہو، قانون کے اساسات وضع کئے ہوں اور ان کی بنیاد پر نظام بھی بنا دیا ہو۔ نظام کو کامیابی کے ساتھ چلا بھی دیا ہو اور دس لاکھ مربع میل رقبے پر اس نظام کے مطابق ریاست اور معاشرت کا قیام بھی کر کے دکھا دیا ہو۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کو بجا طور بنی نوع انسان کا مقنن اعظم کہا جا سکتا ہے۔ اور حضور ہی بنی نوع انسان کے مقنن اعظم کہلانے کے مستحق اور حق دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے معجزات میں ایک بہت بڑا معجزہ خود آپ کی شریعت بھی ہے جو اپنے ربط، نظم، تناسق اور تکامل کے اعتبار سے دنیا کے نظاموں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ بیک وقت معلم اخلاق بھی ہیں اور مقنن بھی ہیں۔ آپ کا دیا ہوا قانون اخلاقی بنیادوں پر مضبوطی سے قائم اور روحانی ہدایات کی روشنی سے مستنیر ہے۔ آپ کے دیئے ہوئے اخلاق محض نظریاتی نعرے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی بنیاد پر ایک پورا عملی نظام متشکل شدہ موجود ہے جس پر کروڑوں انسان عمل پیرا رہے ہیں۔ آپ کے دیئے ہوئے قانون وشریعت پر اخلاقی اصولوں اور صفات سے متصف ہوئے بغیر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مرحلے پر جا کر اخلاق اور قانون دونوں اس طرح جمع ہو جاتے ہیں جیسے آغاز میں جمع ہیں۔ قرآن پاک سے یہ دونوں چیزیں نکلی ہیں اور پوری انسانیت کو اپنے دائرے میں لے کر بالآخر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ مرکز انسان کا مزاج، طبیعت اور ساخت ہے۔ یہ دونوں اخلاق اور قانون وحی الٰہی کے چشمے سے مستنیر ہیں۔ وحی الٰہی ان دونوں کی اساس اور روح ہے۔

مغرب اور دور جدید کا ایک المیہ یہ ہے کہ اس نے اپنے نامکمل مذہب سے مایوس ہو کر اور سینٹ پال کی دی ہوئی مذہبیت کی ناکامی کو دیکھ کر مذہب ہی سے ہاتھ دھو لئے، بجائے اس کے کہ اہل مغرب یہ غور کرتے کہ جو مذہب ان تک پہنچا ہے وہ کس حد تک حقیقی اور مکمل ہے، انہوں نے مذہب ہی سے جان چھڑانے میں عافیت سمجھی۔ مذہب سے جان چھوٹی تو اخلاق سے بھی جان چھوٹ گئی۔ اس لئے کہ مذہب کے علاوہ اخلاق کی کوئی اور مکمل اور پائدار بنیاد آج تک دریافت نہیں ہو سکی۔ جب اخلاق سے بھی جان چھوٹ گئی تو اخلاق اور قانون کا تعلق ختم ہو گیا۔ آج کل مغرب میں ایک بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ہر چیز

ان کو positive درکار ہے۔ پازیٹیو سے مراد مثبت اور منفی والا پازیٹیو نہیں۔ بلکہ آن کے ہاں آج کل پازیٹیو سے مراد یہ ہے کہ جو چیز جیسے ہے ویسے ہی اس پر عمل کیا جائے۔ ہر چیز کو amoral ہونا چاہئے۔ value کو neutral ہونا چاہئے۔ اخلاق، مذہبیات اور روحانیات کا دائرہ محدود کرنا چاہئے۔ ان سب چیزوں کو معاشرتی اور اجتماعی نظام سے دیس نکالا دے دینا چاہئے۔ جب ایک بار اخلاق و روحانیات کو دیس نکالا دے دیا تو پھر قانون کی حقیقی اور پائیدار بنیاد ختم ہوگئی۔ اب قانون کی بنیاد کیا ہو۔ قانون کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی اخلاقی بنیاد نہ ہو۔ مذہبی اقدار سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ کسی مذہب کے پرچھائیں تک ان کے دعوی کے بموجب قانون پر نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قانون ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اپنی معنویت کھوتا چلا جاتا ہے۔ اور اصطلاحات میں ایک تعارض پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ سوشل سائنسز ہوں یا ہیومینیٹیز، ان سب کو ویلیو نیوٹرل ہونا چاہئے۔ یعنی اخلاقی اقدار سے ماورا یا پاک ہونا چاہئے۔ یہ نہ دیکھیں کہ کیا ہونا چاہئے۔ تجربی اور اطلاقی علوم کی طرح انسانی اور معاشرتی علوم میں بھی یہ دیکھیں کہ کیا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں، بلکہ دانستہ نظر انداز کرتے ہیں کہ کیا ہے میں تو بہت کچھ ہے۔ بدکرداری بھی ہے، جھوٹ بھی ہے، بداخلاقی اور بددیانتی بھی ہے۔ ان سب مظاہر کا مطالعہ کرو تو سوشل سائنسز کا مطالعہ ہوگا۔ ورنہ وہ معاملہ معروضی اور مقصدی نہ رہے گا۔ اس طرح کی سوشل سائنس کو خوبصورت ناموں سے یاد کر کے سمجھتے ہیں کہ ان کے تصورات اور خیالات بھی خوش نما ہو گئے ہیں۔

زین لھم الشیطان اعمالھم (۵)

شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کر دیا۔

خوبصورت اصطلاحات کے پردے میں مکروہ اور منفی تصورات کو چھپا دیا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ قانون وہ نہیں ہو سکتا جو کہے کہ کیا ہے۔ معاشرے میں تو قتل ہے، چوری ہے۔ اب اگر قانون یہ کہنا چاہے کہ چوری نہیں ہونی چاہئے تو اس کو ایک ویلیو پوزیشن لینی پڑتی ہے۔ ویلیو پوزیشن وہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ اگر ویلیو پوزیشن قانون کو نہیں دیتے تو وہ قانون نہیں رہتا، اخلاقیات بن جاتا ہے۔ یا سوشیالوجی بن جاتی ہے۔ یہ ایک مسئلہ پچھلے پچیس تیس سال سے مغربی قانون دانوں کو درپیش ہے۔ آج کل jurisprudence پر جو کتابیں آرہی ہیں ان میں یہ مسئلہ بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ قانون کو کیسے موثر بنایا جائے۔ اس طرح کا کوئی مسئلہ فقہائے اسلام کے ہاں پیدا نہیں

ہوا۔اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو شریعت عطا فرمائی تھی اس میں قانون، اخلاق، روحانیات اور مذہبی عقائد، یہ چاروں چیزیں اس طرح یکجا ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

وہ سورتیں دیکھیں جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایک ایک کر کے وہ اخلاقی بنیادیں رکھی جارہی ہیں، روحانیات کی وہ اساسات تعمیر ہورہی ہیں جن پر آگے چل کر قانون کی تعمیر ہوگی۔ یہ meta-jurisprudence کی بنیاد ہے۔ پھر جب حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان اخلاقی عمارتوں کی تکمیل بھی ہوئی۔اس پر قانون کی دیواریں بھی اٹھائی گئیں۔اور قانون، شریعت، اخلاقیات، مذہبیات اور روحانیات سب کی بیک وقت تکمیل ہوگئی۔ یہ ایک ایسا برج اور ایسی عمارت ہے جس کی تعمیر میں یہ چاروں چیزیں یکساں طور پر شامل ہیں۔ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی شریعت کی اس عمارت سے الگ کیا جائے گا تو پوری عمارت غیر عملی اور non-functional ہوجائے گی۔

اس لئے سیرت کو سمجھنے کے لئے اس پوری حکمت شریعت کو کلی طور پر سمجھنا ضروری ہے۔اور حکمت شریعت کو سمجھنے کے لئے سیرت کے واقعات کو سمجھنا ضروری ہے۔ پھر شریعت کے بعض احکام تدریج کے ساتھ آئے ہیں۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ یہ تھا کہ کسی نئے اور اہم حکم کے لئے پہلے صحابہ کرام کو ذہنی طور پر تیار کرتے تھے۔ پہلے یہ بیان فرماتے تھے کہ اللہ کی شریعت کی نظر میں کیا چیز پسندیدہ ہے اور کیا ناپسندیدہ ہے۔اس ابتدائی اشارے سے ہی اکابر صحابہ کرام خود سمجھ جاتے تھے کہ اب شریعت کا کیا حکم آنے والا ہے۔بعض صحابہ کرام کوئی حکم آنے سے قبل ہی اس بات کا پیشگی اندازہ کرلیا کرتے تھے کہ اب شریعت کا کیا حکم آئے گا۔سیدنا عمر فاروق کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ قرآن پاک کی سترہ آیات ان کے اندازے کے مطابق نازل ہوئیں۔یعنی وہ اس حد تک شریعت کے مزاج شناس ہوگئے تھے کہ وہ ایک خاص صورت حال میں اندازہ کرلیا کرتے تھے کہ اس معاملے میں شریعت کیا کہے گی اور سترہ مواقع پر ان کا اندازہ درست نکلا۔

اسی طرح نزول احکام اور اصلاحات نبویہ میں تدریج کا معاملہ ہے۔ یہ شریعت کے احکام کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔مثال کے طور پر ربا کے ناپسندیدہ ہونے کو مکہ مکرمہ میں بیان فرمادیا گیا۔سورۃ روم مکی سورۃ ہے۔اس میں ربا کو ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا ہے۔

وما آتیتم من ربوٰ لیربوفی اموال الناس فلا یربوا عنداللہ (۶)

تم یہ سمجھتے ہو کہ ربا سے تمہارے مال میں اضافہ ہوتا ہے تو اللہ کی نظر میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اسی سے صحابہ کرام سمجھ گئے کہ یہ چیز اسلام میں ناپسندیدہ ہے۔ یوں حرمت سود کی یہ اخلاقی بنیاد آپ ﷺ نے قائم فرمادی۔ اس کے بعد جو پہلا حکم آیا وہ یہ آیا کہ مرکب سود (compound interest) یعنی سود در سود کی حرمت فرمادی گئی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے ربا سے متعلق احکام کو لیا گیا اور آخر میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے ربا کے تمام سابقہ دعاوی کو ختم کر دیا۔ اب اگر یہ تدریج کسی کے سامنے نہ ہوتی تو اس کے لئے حکمت تشریع کو سمجھنا بڑا دشوار ہوتا۔

کچھ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ احکام میں یہ تدریج ہے، بعض درمیانی یا ابتدائی احکام کو لے کر ہمارے اس دور کے بعض غیر اسلامی رواجوں اور غیر شرعی معاملات کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ صرف وہ ربا یا سود حرام ہے جو سود در سود یعنی compound interest کے دائرہ میں آتا ہو۔ حالانکہ کمپاؤنڈ انٹرسٹ کی حرمت تو سود کی حرمت کا ایک مرحلہ تھا۔ اس کے بعد اور بھی مراحل آئے۔ شراب کی حرمت کئی مراحل میں آئی۔ اسی طرح سے کئی اور احکام ایسے ہیں جن کی حرمت یا وجوب کا نزول مختلف مراحل میں ہوا۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نزول احکام اور اصلاحات نبویہ میں تدریج کو سمجھنے کے لئے سیرت سے واقفیت ضروری ہے۔

بعض معاملات ایسے ہیں جن میں نسخ کا اصول کارفرما رہا۔ پہلے لوگوں کو کسی خاص چیز کے لئے تیار کرنے کی خاطر ایک حکم دیا گیا۔ جب لوگوں کی ذہنی اور مزاجی سطح ایک خاص حد پر آ گئی تو پھر دوسرا اصل اور دائمی حکم دیا گیا۔ قرآن پاک میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ نسخ کا یہ تصور قرآن پاک میں کئی جگہ ملتا ہے۔ پانچ چھ آیتوں کے بارے میں تو تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ ان میں نسخ یا تدریج کا یہ عمل ہوا ہے۔ اس طرح احادیث کے کئی احکام کے بارے میں یہ تفصیل موجود ہے۔ جب شراب کی حرمت کا حکم آیا تو حضور ﷺ نے شراب کے بعض برتنوں کے استعمال سے منع کرنے کا حکم بھی دیا کہ میں تمہیں شراب کے فلاں فلاں برتنوں کے استعمال سے بھی روکتا ہوں۔ جب شراب کی پابندی عام ہو گئی اور لوگ شراب کے بغیر زندگی کے عادی ہو گئے اور انہوں نے ان برتنوں کا استعمال بھی ترک کر دیا تو ان کی حرمت بھی ختم کر دی گئی۔ شراب سازی اور شراب دری کے برتنوں کی یہ حرمت ایک وقتی چیز تھی، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حکومت وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی بڑی برائی کو روکنے کے لئے اس برائی کے ذرائع کا راستہ بھی بند کر دے۔ چاہے اس راستے میں فی نفسہ کوئی برائی نہ ہو، لیکن اگر وہ راستہ کسی برائی کی طرف لے جاتا ہو تو برائی کو روکنے کی خاطر اس راستے کو بھی روکا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ان اقدامات

سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کا اختیار حکومت کو حاصل ہے۔

یہ جو تدریج آپ نے اختیار فرمائی۔ یہ حکمت تشریع کا بہت اہم حصہ ہے۔ یہ حکمت تشریع کی ایک بہت اہم بنیاد ہے۔ حکمت تشریع کا ایک اور اہم اصول جس کی طرف مختلف موضوعات کے ضمن میں اور مختلف مواقع پر آپ ﷺ نے بار بار توجہ دلائی وہ تیسیر کا حکم ہے یعنی آسانی پیدا کرنا۔ خود قرآن پاک میں ارشاد ہے:

یریدبکم اللہ الیسر ولایریدبکم العسر (۷)

اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں چاہتا۔

پھر آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر جب مختلف لوگوں کو مختلف حیثیتوں میں باہر بھیجا، کسی کو قاضی، کسی کو گورنر، کسی کو معلم بنا کر بھیجا، تو ان کو یہ ہدایت دی کہ لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرو اور مشکل پیدا نہ کرو۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل دونوں کو ایک ذمہ داری پر بھیجا اور ان سے فرمایا:

یسرا ولاتعسرا، بشرا ولا تنفرا (۸)

آسانی پیدا کرنا، مشکل پیدا نہ کرنا۔ لوگوں کو خوش خبری دینا، متنفر نہ کرنا۔

اس لئے تیسرے کے پہلو کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر کچھ فیصلے فرمائے۔ بعض اقدامات کئے۔ اگر تیسیر کا اصول سامنے نہ ہو تو ان معاملات کو سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی۔

پھر قرآن پاک میں حکمت تشریع کے دو اصول اور بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں پر غیر ضروری قانون سازی کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اس ضمن میں ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے قرآن پاک میں کہا گیا ہے:

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (۹)

یہ پیغمبر لوگوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور جو زنجیریں ان پر لاد دی گئی ہیں وہ دور فرماتے ہیں۔

اس اصول کا صاف الفاظ میں مفہوم یہ ہے کہ عامۃ الناس پر قواعد وضوابط کا بوجھ کم سے کم ڈالا جائے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو آج دنیا کچھ حوالوں سے ڈی ریگولیشن قرار دیتی ہے۔ جس کو ون ونڈو آپریشن کہتے ہیں، یہ کیا ہے؟ اس کے معنی یہی ہیں کہ قانون کے بوجھ کو حتی الامکان کم کیا جائے اور لوگوں کے لئے آسانی پیدا کی جائے۔ یہی بات حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ آسانی پیدا کرو اور مشکل پیدا نہ کرو۔

غیر ضروری طور پر قوانین کا بوجھ نہ بڑھاؤ۔ پابندیاں کم سے کم کرو۔ بوجھ کو گھٹاؤ اور لوڈ شیڈنگ کرو۔ لوگوں کے لئے حرج یعنی غیر ضروری مشکل اور مشقت پیدا نہ کرو۔ رفع حرج اور دفع مشقت بھی شریعت کی حکمت کا ایک عام اصول ہے۔

ایک اور اہم بات جو حضور ﷺ نے حکمت تشریع کے حوالے سے بیان فرمائی وہ بڑی غیر معمولی ہے، جس کو نہ جاننے اور نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ حکمت تشریع یہ ہے کہ شریعت کے جو بنیادی مقاصد اور اہداف ہیں سب سے پہلے ان پر توجہ دی جائے۔ اگر بنیادی اہداف اور بعد والی چیزوں میں کوئی تعارض ہے تو اہداف کو ترجیح دی جائے۔ جب اہداف قائم ہو جائیں تو پھر بعد والی چیزوں پر توجہ دی جائے۔ بعد والے احکام اور شریعت کی مندوبات میں کوئی تعارض ہے تو مندوبات کو نظر انداز کر کے واجبات کو ترجیح دی جائے۔ مندوبات اور مباحات میں تعارض ہے تو مباحات کو نظر انداز کر کے مندوبات کو ترجیح دی جائے۔ یہ ترتیب شریعت کی حکمت کا ایک بنیادی اور لازمی حصہ ہے۔ بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا حکم جو شریعت میں مطلوب ہو، جس کا شریعت حکم دیتی ہو، جس کو شریعت قائم کرنا چاہتی ہو، لیکن آپ یا فیصلہ کرنے والے دیانت داری سے یہ سمجھیں کہ اگر اس حکم پر عمل کیا گیا تو اس کے نتیجے میں بہت سی ایسی قباحتیں پیدا ہو جائیں گی جو اس حکم پر عمل نہ کرنے کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ہوں گی۔ اور اگر فی الحال اس کو نظر انداز کر لیا جائے تو شاید اتنی قباحتیں پیدا نہ ہوں تو اُس حکم پر عمل درآمد کو وقتی طور پر ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں عرض کرتا ہوں جو اس معاملے میں بہت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور سیرت کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر فرمائی تو کعبے کی عمارت مستطیل تھی۔ ایک طرف سے بیضوی تھی اور دوسری اطراف سے مستطیل تھی۔ اس وقت کی کی عمارت کی طرح چوکور نہیں تھی۔ اسی طرح سے یہی عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے رسول اللہ ﷺ کے بچپن تک چلی آ رہی تھی۔ جو چوکور نہیں تھی، مستطیل تھی اور آگے سے بیضوی شکل کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی نوجوانی کا زمانہ تھا جب مکہ مکرمہ میں سیلاب آیا جس سے کعبے کی دیواروں کو نقصان پہنچا اور دیواریں گر گئیں۔ کچھ سامان سیلاب کے ساتھ بہہ گیا۔ اس وقت قریش مکہ نے یہ طے کیا کہ ہم بیت اللہ کی عمارت کی از سر نو تعمیر کریں گے۔ چونکہ ملت ابراہیمی کے کچھ نہ کچھ آثار اور بقایا جات ان میں موجود تھے۔ اس لئے ان کو یہ احساس تھا کہ ہماری آمدنی کا خاصا حصہ ناجائز اور ناپاک آمدنی پر مشتمل ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر

شخص جائز اور پاکیزہ آمدنی لاکر جمع کرے، اس سے ہم کعبے کی تعمیر کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے جائز اور پاکیزہ دولت جمع کی۔ اس سے سامان خریدا۔ مزدور لگائے اور بیت اللہ کی تعمیر نو شروع ہوگئی۔ یہ وہی موقع تھا جب رسول اللہ ﷺ کو حجر اسود کی تنصیب کے لئے متفقہ طور پر چنا گیا تھا اور آپ ﷺ کے صادق و امین ہونے کا اعتراف کیا گیا تھا۔ جب یہ تین اطراف کی دیوار بن گئی اور چوتھی طرف کی دیوار رہ گئی تو پیسے ختم ہوگئے۔ باقی جو پیسہ تھا وہ ناجائز کاروبار، لوٹ مار کا اور چوری کا پیسہ تھا وہ انہوں نے لگایا نہیں۔ اس پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس وقت عمارت کو نامکمل چھوڑ دیا جائے اور آگے نامکمل حصے کا ایک نشان چھوڑ دیا جائے، بعد میں جب جائز وسائل دستیاب ہوں گے تو اس کو مکمل کر دیں گے۔

چند سال کے بعد رسول اللہ ﷺ نبوت کے منصب پر فائز ہوگئے۔ آپ نے اسلام کی دعوت دی اور لوگ دعوت کی موافقت اور مخالفت میں لگ گئے۔ مکہ مکرمہ میں لوگوں کی توجہ اس طرف ہوگئی اور بیت اللہ کی تعمیر یا نامکمل عمارت کی تکمیل کا معاملہ پس پشت چلا گیا۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ اگر تمہاری قوم اسلام میں نئی نئی داخل نہ ہوئی ہوتی اور مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ یہ اسلام سے پھر جائے گی تو میں کعبے کی عمارت کو ڈھا کر دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دیواروں پر استوار کرتا۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشے کے مطابق بیت اللہ کی تعمیر نو شریعت کا ایک مقصد تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بیت اللہ کی عمارت کو گرانے کی ضرورت تھی اور بیت اللہ کی عمارت گرانے سے یہ خطرہ تھا کہ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔ منافقین کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ پہلے تو اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا بڑا پیرو کہتے تھے۔ لیکن کامیابی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے کام ہی کو ڈھا دیا۔ اس کے نتیجے میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ لہٰذا لوگوں کے برگشتہ ہونے کے خطرے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے یہ کام نہیں کیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ شریعت کے مقاصد اور احکام میں یہ دیکھنا چاہئے کہ بڑا مقصد کون سا ہے۔ چھوٹا مقصد کون سا ہے۔ کسی چھوٹے مقصد کی خاطر بڑے مقصد کو نظر انداز کر دینا حضور ﷺ کی سیرت، سنت اور حکمت تشریع کے خلاف ہے۔

یہ نہ سمجھئے گا کہ مقصد کے بڑا یا چھوٹا ہونے کا یہ تعین بڑا دشوار کام ہے۔ یہ کام فقہائے اسلام اور

محدثین بہت پہلے کر چکے ہیں۔ تمام فقہائے اسلام اور محدثین نے چودہ سو برس غور کر کے یہ معاملہ صاف کر دیا ہے کہ شریعت کے احکام میں کس حکم کی کیا حیثیت ہے اور کس حکم کو کس درجے پر رکھنا چاہئے۔ چونکہ بہت سے مواقع پر یہ چیز نظر انداز ہو جاتی ہے اس لئے بہت سے حضرات اس ترتیب، تدریج اور اس حکمت تشریع کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے نظر انداز کر دینے سے ہی یہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان مسائل کی وجہ سے مخالفین اور کمزور عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو اسلام کے بارے میں بہت سی باتیں کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔

فقہیات سیرت میں ایک اہم چیز جو ضروری ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک اور آپ کے عہد مبارک کے ماحول سے واقفیت ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں کون سا محاورہ رائج تھا۔ کون سی عادات اور طور طریقے رائج تھے۔ یہ جاننا شریعت کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ پاکیزہ اور طیب چیزیں کھاؤ۔ کئی جگہ یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے جائز ہیں اور ناپاک چیز تمہارے لئے ناجائز ہیں۔

احل لکم الطیبات (۱۰)

پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے جائز قرار دی گئی ہیں۔

اب فقہا کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ پاکیزہ چیزوں سے کیا مراد ہے۔ جو چیزیں قرآن پاک یا احادیث میں صراحتاً جائز قرار دی گئیں ان کا پاکیزہ ہونا تو معلوم ہے۔ ان کے علاوہ کس کس چیز کو پاکیزہ سمجھا جائے۔ اس پر محدثین اور فقہا کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قوم یعنی عرب اور قریش اور ملت ابراہیمی، ان کے محاورے اور معاشرہ میں جو چیز طیب سمجھی جاتی تھی وہ طیب سمجھی جائے گی۔ جو چیز ناپاک اور گندی سمجھی جاتی تھی اس کو ناجائز اور حرام سمجھا جائے گا۔ اس اصول کے تحت کچھ جانوروں کا گوشت اور دودھ جائز ہے۔ کچھ جانوروں کا دودھ اور گوشت جائز نہیں ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں ایسے مقام بھی آتے ہیں جن میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ ان کا شمار پاکیزہ چیزوں میں ہے یا ناپاک چیزوں میں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں نہ تو نصوص میں کوئی صراحت ہے اور نہ عمومی قواعد کی روشنی میں ان کی حیثیت طے کی جا سکتی ہے۔ ایسی چیزوں کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ پاکیزہ ہیں اور یہ ناپاک ہیں۔ ایسی چیزوں میں ہر فرد اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق فیصلہ کرے۔ چونکہ یہ معاملہ ذوق کا ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنا ذاتی اور شخصی ذوق بیان فرمانے

میں کوئی تامل نہیں فرمایا، لیکن زبردستی لوگوں کو مجبور بھی نہیں کیا کہ وہ لازماً آپ ﷺ ہی کے ذاتی ذوق کی پیروی کریں۔ یہ بات بڑی اہم ہے۔ اس لئے میں اس کو زیادہ وضاحت سے کہنا چاہتا ہوں۔

کچھ چیزیں ہیں جو شریعت میں واضح طور پر حرام اور ناجائز ہیں۔ وہ حدیث کے ذریعے ناجائز ہوئی ہوں یا قرآن پاک کے ذریعے، ان کے ناجائز ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر حرام یا ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ بالواسطہ طور پر ان کے جائز ہونے ہی کے بارے میں اشارہ فرمایا۔ لیکن ذاتی طور پر آپ نے ان کو پسند نہیں فرمایا۔ لیکن آپ نے دوسروں سے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ چونکہ یہ چیز مجھے پسند نہیں اس لئے تم بھی اس کو ناپسند کرو۔ اس کی ایک نمایاں مثال فتح مکہ کے موقع پر سامنے آئی۔ عرب میں ایک جانور ہوتا تھا ضب (گوہ)۔ یہ خرگوش اور بڑے چوہے کے درمیان ایک مخلوق تھی۔ چوہے سے بڑی اور خرگوش سے ذرا چھوٹی قسم کا ایک جانور تھا جس میں چوہے اور خرگوش دونوں کے خصائص پائے جاتے تھے۔ خرگوش پاکیزہ ہے۔ لوگ اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ چوہا ناپاک ہے اور لوگ نہیں کھاتے۔ عرب میں گوہ کا گوشت کھانے کا عام طور پر رواج تھا۔ غیر عرب لوگ عربوں پر طعن کیا کرتے تھے کہ تم گوہ کا گوشت کھاتے ہو۔ اسلام کے آنے کے تقریباً چار سو سال بعد بھی فردوسی نے عربوں کو یہ طعنہ دیا۔ فردوسی نے اپنے مشہور شاہنامہ میں لکھا ہے کہ

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو برتوائے چرخ گرداں تفو

امید ہے کہ یہ فردوسی کے ذاتی جذبات نہیں ہوں گے۔ اس نے کسی اور کے جذبات کی ترجمانی کی ہوگی۔ ایک مسلمان کے جذبات یہ نہیں ہو سکتے۔ گویا گوہ کا گوشت ایک ایسی چیز تھی جس پر طنز و تشنیع بھی کی جاتی رہی ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر ایک روز جب رسول اللہ ﷺ دسترخوان پر تشریف فرما تھے تو گوہ کا گوشت بھی دسترخوان پر لایا گیا۔ بہت سے لوگ موجود تھے جن میں عام سپاہی بھی تھے اور کبار صحابہ بھی تھے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ جواب ملا کہ حضور یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ نے اس برتن کو دور کر دیا۔ اس پر صحابہ نے یک دم پوچھا کہ کیا یہ ناجائز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ناجائز نہیں ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ

لم یکن بارض قومی فاجدنی اعافه(۱۱)

یہ چیز میرے علاقے میں رائج نہیں تھی۔ اس لئے میں اس کو ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا۔ مجھے اس کا ذوق نہیں ہے یا یہ میرے ذوق کے خلاف ہے۔

حضرت خالد بن ولید دستر خوان پر موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ میں کھالوں؟ آپ ﷺ نے پلیٹ ان کی طرف کردی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضور کے دستر خوان پر تشریف فرما ہونے کے باجود اور یہ سننے کے باوجود کہ حضور ﷺ شخصی طور پر اس کو پسند نہیں کرتے، گوہ کا یہ گوشت تناول فرمایا۔ (۱۲) ان کے بارے میں تو تصریح ہے اور باقی صحابہ نے بھی لیا ہوگا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ جو چیز حلال وحرام کے بالکل درمیان میں ہوگی اس میں ذوق مختلف ہوسکتا ہے۔ کسی کا ذوق ایک چیز کے کھانے کی اجازت دے گا اور کسی کا ذوق اجازت نہیں دے گا۔ لیکن جب درمیان کا ایریا ہوگا تو وہاں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ چیز طیبات کے قریب ہے یا خبیثات کے۔ یعنی جو طیبات ہوں گی وہ جائز ہوں گی اور جو طیبات نہیں ہوں گی وہ ناجائز ہوں گی۔

اس معاملے میں اس عربی زبان کا محاورہ، جو رسول اللہ ﷺ بولتے تھے یا جو زبان آپ کے زمانے میں بولی جاتی تھی، اس کو بنیاد قرار دیا جائے گا۔ حضور ﷺ کا رواج اور طور طریقہ اور آپ کی قوم یعنی ملت ابراہیمی کا طریقہ بنیاد قرار دیا جائے گا اور اس کی بنیاد پر چیزوں کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ فقہیات سیرت کا یہ مضمون شروع سے سیرت نگاروں، محدثین اور فقہا کی دلچسپی کا رہا ہے۔

اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل، جامع اور مستند کتاب علامہ ابن قیم کی زاد المعاد ہے۔ ابن قیم نے سیرت کے تمام پہلوؤں کو ایک ایک کرکے بیان کردیا ہے۔ پھر ان سے جو فقہی احکام نکلتے ہیں وہ بیان کئے ہیں۔ جو دروس اور عبرتیں کسی سبق میں پنہاں ہیں وہ بیان کی ہیں۔ حتیٰ کہ غزوات کے بیان کے بعد جنگی قانون کے احکام تو نکالے ہی ہیں، معاہدات اور صلح کے احکام تو یقیناً بیان کئے ہیں۔ لیکن جزوی اور انفرادی معاملات کے بہت سے احکام بھی مختلف غزوات کے دوران جو واقعات پیش آئے ان سے استفادہ کرکے بیان کئے۔ نیز بہت سے اخلاقی پہلو بھی بیان کئے ہیں۔

مثال کے طور پر غزوہ احد کے واقعات کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے پہلے غزوہ احد کے احکام اور تفصیلات بیان کی ہیں۔ پھر سولہ احکام بیان کئے ہیں جو غزوہ احد کے واقعات اور معاملات سے نکلتے ہیں۔ پھر ایک اور فصل میں جو حکم، دروس اور عبرتیں غزوہ احد کے سارے قصے میں پنہاں ہیں وہ بیان کی ہیں۔ صلح

حدیبیہ کی تفصیلات بیان کر کے ۳۴ فقہی احکام بیان کئے ہیں۔ یہ سارے کے سارے مباحث فقہیات سیرت کا ایک انتہائی اہم اور بنیادی مضمون ہے۔ سورۃ فتح کی روشنی میں صلح حدیبیہ کی حکمتیں، ان کے احکام، اسی طرح سے فتح مکہ اور غزوہ تبوک سے الگ الگ احکام نکالے ہیں۔ بعض جگہ ارباب سیرت میں چونکہ واقعات کی تفصیلات میں اختلاف ہے، اس لئے اس اختلاف کے نتیجے میں احکام میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر قانون جنگ کا ایک حکم یہ ہے کہ اگر کوئی شہر کسی جنگ کے نتیجے میں فتح ہو تو مفتوحہ علاقوں کے احکام اور ہیں۔ اور اگر صلح کے نتیجے میں فتح ہو تو اس کے احکام وہ ہوں گے جو صلح کی شرائط میں طے کئے گئے ہوں۔ اسلامی تاریخ میں کئی مواقع ایسے آئے ہیں کہ کچھ علاقے جو صلح کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے ہیں، ایسے علاقوں پر صلح کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔ کچھ علاقے فتح کے ذریعے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے، ان پر فتح کے احکام جاری کئے گئے۔

اس کی بڑی دلچسپ مثال دمشق کی فتح ہے۔ مسلمان دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت ابوبکر صدیق کے زمانے میں حضرت خالد بن ولید پوری فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ حضرت عمر فاروق ان کے بعض فیصلوں کے بارے میں شرح صدر نہیں رکھتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ سپریم کمان سے حضرت خالد کو معزول کر دینا چاہئے۔ جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو پہلا کام انہوں نے حضرت خالد کی معزولی کا حکم بھیجنے کا کیا اور کمان حضرت ابوعبیدہ کے ہاتھ سونپنے کی ہدایت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ اتنے غیر معمولی انسان تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضور کی وفات کے بعد جو دو نام خلافت کے لئے تجویز کئے تھے ان میں سے ایک حضرت ابوعبیدہ کا تھا۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ تم میں حضرت عمر فاروق اور حضرت ابوعبیدہ موجود ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ یعنی وہ اس درجے کے انسان تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق کے نزدیک ان کا نام حضور کے براہ راست جانشین کے طور پر ایک موزوں اور مناسب نام تھا۔

جب حضرت ابوعبیدہ کو اپنے تقرر کا یہ خط ملا تو انہوں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی اور خط اپنے پاس رکھ لیا۔ قاصد کو بتایا کہ کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلے کہ خلیفۂ رسول ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے، اور ان کی جگہ نئے خلیفہ منتخب ہو گئے ہیں اور نئے خلیفہ نے سپریم کمان تبدیل کر دی ہے۔ وہ خود بدستور حضرت خالد کی کمان میں جنگ کرتے رہے۔ شہر کے ایک طرف کے دروازے پر حضرت ابوعبیدہ کمان کر رہے تھے۔ دوسری طرف کے دروازے پر حضرت خالد خود کمان کر رہے تھے۔ دونوں کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔

حضرت ابوعبیدہ نے اپنے علاقے کے دروازے پر مقرر کردہ دشمن کے کماندار سے مصالحت کر لی۔ اور اس سے طے کر لیا کہ وہ چند طے شدہ شرائط پر شہر کا دروازہ کھول دے اور مسلمان فوجیں صلح کر کے شہر میں داخل ہوں۔ عین اسی وقت جب صلح کی یہ گفتگو مکمل ہوئی، حضرت خالد شہر کا دروازہ توڑ کر شہر میں فاتحانہ داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت خالد کو ابوعبیدہ کی اس کارروائی کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت ابوعبیدہ کو حضرت خالد کے فاتحانہ داخل ہو جانے کا علم نہیں تھا۔ حضرت خالد کا خیال یہ تھا کہ وہ ایک طرف سے داخل ہو کر شہر کے دوسرے دروازہ کی طرف سے نکل جائیں گے تو پورا شہر فتح ہو جائے گا۔ لیکن جب فوجیں درمیان میں آئیں تو دیکھا کہ دوسری طرف سے ابوعبیدہ کمان کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ حضرت خالد نے پوچھا کہ آپ کیسے داخل ہوئے؟ انہوں نے کہا کہ صلح کر کے داخل ہوا ہوں۔ اس پر حضرت خالد نے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ تمہاری وجہ سے اب وہ مراعات دینی پڑیں گی جو صلح میں دی جاتی ہیں۔ آپ نے کیوں صلح کی اور کس کی اجازت سے کی؟ حضرت ابوعبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ حضرت خالد کے پاس کمان تھی اس لئے انہوں نے بہت کچھ کہا۔ روایت میں آتا ہے کہ بہت سخت سست کہا۔ حضرت ابوعبیدہؓ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر یہ طے ہوا کہ جہاں دونوں کمانداروں کے گھوڑوں کے سر آپس میں ملے ہیں وہاں ایک لکیر کھینچ دی جائے۔ آدھے شہر پر فتح کے احکام جاری ہوں گے اور آدھے پر صلح کے احکام جاری ہوں گے۔ چنانچہ آدھے دمشق شہر پر وہ احکام جاری ہوئے جو حضرت ابوعبیدہ نے صلح کی شرائط کے ضمن میں طے کئے تھے۔ آدھے پر فتح کے احکام جاری ہو گئے۔ جب یہ سارے معاملات طے ہو گئے اور سب لوگ ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر اپنے کیمپ میں پہنچے تو حضرت خالد نے پوچھا کہ آخر آپ نے اتنا اہم فیصلہ کرنے کے لئے مجھ سے اجازت کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی۔ اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے وہ خط دکھایا کہ اس لئے نہیں پوچھا۔ خط دیکھ کر حضرت خالد رو پڑے اور کہا کہ ما ئیں تم جیسا آدمی جننے سے قاصر ہیں۔

اس طرح کا اختلاف فتح مکہ کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں بھی ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو فتح مکہ اور شہر کی حیثیت کیا تھی۔ کیا یہ فتح جنگ کے نتیجے میں ملی تھی یا صلح کے نتیجے میں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ صلح کے نتیجے میں فتح ہوا۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے فتح ہوا۔ دونوں میں فرق ہے۔ جو فقہائے کرام سمجھتے تھے کہ مکہ صلح کے نتیجہ میں فتح ہوا ان کے نزدیک مکہ کی زمین اور مکانات کے احکام اور ہیں۔ جو سمجھتے تھے کہ مکہ بزور اور فوج کشی کے ذریعے فتح ہوا ہے ان

کے خیال میں مکہ کی جائدادوں کے احکام اور تھے۔ابن قیم نے بھی اس بارے میں رائے دی ہے۔

فقہیات سیرت کا بڑا میدان اقضیۃ الرسول کا میدان ہے، یعنی عدالت نبوی اور دربار رسول ﷺ کے فیصلے۔رسول اللہ نے بطور قاضی اور سربراہ ریاست کے جو فیصلے کئے تھے وہ کیا تھے۔ان سب فیصلوں کو الگ الگ موضوع وار یکجا جمع کرنے کی آج سے نہیں بلکہ ایک ہزار سال سے کوششیں ہورہی ہیں۔محدثین نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں حضور ﷺ کے فیصلے نقل کئے ہیں۔امام بخاری، امام ترمذی اور کئی ایک دوسرے محدثین نے ان کے لئے الگ الگ ابواب اپنی اپنی کتابوں میں باندھے ہیں۔محدثین کے ان ابواب کے علاوہ الگ سے منفرد کتابیں بھی اس موضوع پر لکھی گئیں۔خود ابن قیم نے زاد المعاد کی پانچویں جلد ساری کی ساری اسی کام کے لئے وقف کی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بیان فرمایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دنیاوی معاملات کے بارے میں یہ فرمایا تھا

انتم اعلم بامور دنیاکم

کہ تم اپنے دنیاوی معاملات سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو۔

یہ بعض صورتوں میں تو بالکل واضح ہوتا تھا اور صحابہ کرام کو اس بارے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات ان معاملات میں جہاں صحابہ کرام کو شبہ ہوتا تھا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ فیصلہ ان دونوں میں سے کون سی نوعیت کا ہے۔اس کی ایک بڑی مثال غزوہ بدر کے موقع پر سامنے آئی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ طے کرلیا کہ اب قریش کے لشکر سے مقابلہ کرنا ہے اور قریش کی فوجوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوکر رہے گی تو آپ نے ایک جگہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہاں مسلمانوں کی فوج کو کیمپ قائم کرنا چاہئے۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج وہاں کیمپ لگا کر قیام کی تیاری کرنے لگی۔اس پر ایک انصاری صحابی حضرت حباب بن المنذرؓ نے جو انصار میں ایک بڑے صاحب الرائے سردار تھے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ یارسول اللہ یہ جگہ جو آپ نے منتخب کی ہے تو کیا اس انتخاب کا حکم اللہ نے دیا ہے؟ اگر وحی کے ذریعے یہ جگہ منتخب کی گئی ہے تو اس میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے

ام هو الرأي والحرب والمكيدة،

یا یہ آپ کی ذاتی رائے اور جنگی تکنیک اور چال ہے؟

آپ نے فرمایا

بل هو الرأي والحرب والمكيدة،

بلکہ یہ میری ذاتی رائے، جنگی حکمت عملی اور تکنیک ہے۔

حضرت حباب بن المنذر نے عرض کیا کہ پھر میرا خیال یہ ہے کہ یہ جگہ نہیں بلکہ فلاں جگہ زیادہ موزوں ہے۔ پھر انہوں نے اس جگہ کی خوبیاں بیان کیں۔ تو آپ نے حضرت حباب بن المنذر کی رائے سے اتفاق فرمایا اور اپنی رائے سے رجوع فرمالیا۔ (۱۳) اس موضوع پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ میں بہت سے مباحث اس مضمون سے متعلق بیان کئے ہیں۔

اب ایک اہم سوال اٹھاتا ہوں وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے جو مختلف فیصلے یا ارشادات ہیں، ان میں سے کس ارشاد کی کیا نوعیت ہے، اس کا فیصلہ کیسے ہوگا اور ان کی قسمیں کیا ہیں۔ ایک مشہور فقیہ اور اصولی امام ابوالعباس احمد بن ادریس قرافی (متوفی ۶۸۴) ہیں۔ انہوں نے ایک عظیم الشان اور منفرد کتاب لکھی ہے جس کی مثیل یا نظیر فقہ اسلامی کے پورے لٹریچر میں نہیں ہے۔ یہ چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب تو دو جلدوں میں ہے اور کئی بار چھپی ہے۔ حال ہی میں ہمارے دو فاضل دوستوں نے اس کو ایڈٹ کر کے چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا نام کتاب الفروق ہے۔ اس میں انہوں نے ایسی چیزوں کے درمیان فرق کی نشاندہی کی ہے اور غالباً ساڑھے پانچ سو فرق بیان کئے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں لیکن دراصل ان کے درمیان فرق ہے۔ اس فرق کو سمجھنا اسلامی قوانین کی نزاکتیں سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے چھتیس واں فرق یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مختلف احکام اور تصرفات کے درمیان کیا فرق ہے۔

انہوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جتنے تصرفات ہیں، یعنی فیصلے، وہ عملی فیصلے ہوں یا زبانی ارشادات ہوں، وہ تین قسموں میں منقسم ہیں۔ کچھ فیصلے تو وہ ہیں جو آپ نے بطور قاضی کے ارشاد فرمائے۔ آپ ﷺ مدینہ منورہ کی ریاست کے سب سے بڑے قاضی تھے۔ سارے معاملات کی حتمی اپیل آپ کے روبرو پیش ہوتی تھی۔ کچھ معاملات وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ دین کے طور پر ارشاد فرمائے۔ جس کی تبلیغ بطور نبی اور بطور صاحب شریعت کے آپ نے فرمائی۔ کچھ تصرفات وہ ہیں جو بطور سربراہ ریاست یا انتظامی سربراہ کے آپ نے فرمائے۔

امام قرافی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہر منصب کا مصدر و ماخذ ہے۔ مسلمانوں میں کوئی منصب ایسا نہیں ہے جس میں اصل مصدر اور ماخذ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی نہ ہو، جس میں ہدایت اور رہنمائی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے نہ ملتی ہو۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ

ﷺ کے اکثر فیصلے اور ارشادات بطور تبلیغ شریعت اور ہدایت شریعت کے ہیں۔ آپ کا اصل منصب یہ تھا کہ آپ ﷺ شریعت عطا فرمانے والے ہیں، اللہ کی مرضی کی ترجمانی فرمانے والے ہیں۔ قرآن پاک کی تشریح اور وضاحت فرمانے والے ہیں اور آپ کے احکام کا بیشتر حصہ اسی حیثیت میں ہے۔ کچھ احکام وہ ہیں جن کے بارے میں بالاتفاق علما کی رائے ہے کہ وہ آپ نے بطور قاضی کے ارشاد فرمائے۔ حضور کے سامنے ایک مقدمہ آیا۔ دو آدمیوں نے اپنی روئداد اور مقدمہ پیش کیا۔ آپ نے دونوں کی بات سن کر ایک کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہ ارشاد بداہتاً بطور قاضی کے ایک عدالتی فیصلہ ہے۔ یہ انہی دو حضرات کے درمیان واجب التعمیل ہوگا جو مقدمہ کے فریق تھے۔ باقی لوگوں کے ساتھ اس کا براہ راست تعلق نہیں ہوگا۔ کچھ فیصلوں کے بارے میں اتفاق ہے کہ یہ فیصلے حضور نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائے۔ وہ بھی واضح ہیں۔ مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی کو گورنر مقرر کیا۔ ظاہر ہے کہ گورنر کی یہ تقرری نہ بطور قاضی کے تھی نہ بطور نبی کے تھی، بلکہ بطور سربراہ ریاست کے تھی۔ حضور نے حضرت اسامہؓ کو لشکر کا کمانڈر مقرر کیا تو یہ بطور سربراہ ریاست کے ایک انتظامی حکم تھا۔ اس طرح کے فیصلے جن کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ بطور سربراہ ریاست یا بطور قاضی القضاۃ کے تھے معلوم اور متعین ہیں۔ لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں اور ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں یہ امر واضح نہ ہو کہ حضور نے یہ فیصلہ کس حیثیت میں فرمایا۔ اس طرح کے معاملات میں جن اہل علم کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ بطور سربراہ ریاست کے تھا وہ اس پر اس طرح کے احکام منطبق کرتے ہیں جو سربراہ ریاست کے احکام پر منطبق ہوتے ہیں۔ جن کے نزدیک وہ فیصلہ بطور رسول کے تھا وہ وہ احکام منطبق کرتے ہیں جو بطور نبی اور رسول کے آپ ﷺ کے ارشادات پر منطبق ہوتے ہیں۔

ان تصرفات کی نوعیت کا تعین کرنے کے لئے کچھ تو بنیادی تصورات ہیں جو ہر ایک کے سامنے واضح ہیں۔ مثلاً جو فیصلے یا تصرفات رسول اللہ ﷺ نے بطور امام یا سربراہ ریاست کے فرمائے، مثلاً تقرریاں فرمائیں، کسی کو کوئی زمین عنایت فرمائی، کسی کو مال غنیمت میں کچھ حصہ دیا، کسی کو بیت المال سے کوئی وظیفہ دیا، تو یہ سارے فیصلے وہ ہیں جو آپ ﷺ نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائے۔ بطور قاضی کے جو فیصلے کئے یہ وہ ہیں جو آپ نے فریقین کے درمیان فرمائے۔ جہاں کوئی حکم شرعی بیان فرمایا گیا، کوئی ہدایت قرآن پاک کی روشنی میں آپ نے بیان فرمائی، یہ وہ احکام ہیں جو بطور نبی اور رسول کے آپ نے بیان فرمائے۔

اس واضح تقسیم کے باوجود پھر بھی چند معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ یہ فیصلہ آپ نے کس حیثیت میں فرمایا تھا۔ ان میں سے دو مثالیں میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جگہ فرمایا تھا کہ

من احیا ارض میتة فهی له (۱۴)

جو شخص کسی غیر آباد زمین کو آباد کرلے گا وہ زمین اس کی ملکیت شمار ہوگی۔

یہ حضور کا ارشاد گرامی ہے اور تمام محدثین نے اس کو روایت کیا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا کہنا یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد بطور حکم شریعت تھا، بطور دینی رہنمائی کے تھا۔ لہٰذا یہ شریعت کا عام حکم ہے اور جس شخص کا جب جی چاہے، اسلامی ریاست کی حدود کے اندر جس غیر آباد اور مملوکہ زمین کو وہ آباد کرلے تو وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی۔ انہوں نے اس کے تفصیلی احکام بھی بیان کئے ہیں کہ مردہ زمین سے کیا مراد ہے۔ اس کو آباد کرنے سے کیا مراد ہے۔ آباد کرنے کے تقاضے کیا ہیں۔ جب وہ آباد کرنے کا ارادہ کرلے تو کب تک اس کو یہ مہلت دی جائے گی کہ وہ اس کو آباد کرلے۔ اس کی پوری تفصیل فقہ شافعی اور فقہ مالکی کی مستند کتابوں میں مدون شدہ موجود ہے اور فقہ کی ہر کتاب میں احیاء الموات سے متعلق ابواب میں ساری تفصیلات موجود ہیں۔

اس کے برعکس حضرت امام ابوحنیفہ کا ارشاد یہ ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائی تھی۔ یعنی حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے شہریوں کو بطور سربراہ ریاست کے اجازت دی تھی کہ جس کا جی چاہے عرب میں کوئی غیر آباد زمین آباد کرلے، اور جب وہ اس زمین کو آباد کرلے گا تو وہ اس کی ملکیت قرار پا جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ حکم ہر وقت کے لئے اور ہر شخص کے لئے نہیں ہے۔ اگر کوئی حکومت کسی خاص موقع پر اس کی اجازت دے تو اس اجازت کے مطابق عمل ہوسکتا ہے ورنہ نہیں ہوسکتا۔ حکومت کی واضح اور صریح اجازت کے بغیر یہ نہیں ہوسکتا کہ جب جس کا جی چاہے غیر آباد سرکاری زمین اپنے قبضہ میں لے کر اس کو آباد کرلے اور اپنی ملکیت قرار دے لے۔ اس لئے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے بطور سربراہ ریاست کے فرمائی تھی۔ جید فقہائے اسلام کے درمیان اس مسئلہ پر گزشتہ بارہ سو سال سے بحثیں ہو رہی ہیں۔

شافعی اور مالکی فقہا نے بہت شد و مد سے امام ابوحنیفہ کی اس رائے پر تنقید فرمائی۔ اور اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ امام ابوحنیفہ کس طرح اور کس بنیاد پر اتنے کھلے اور واضح حکم کو بطور سربراہ ریاست کے ایک فیصلہ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن آج نہیں بلکہ کئی سو سال سے دنیا میں امام ابوحنیفہ ہی کے نقطہ نظر پر عمل ہو رہا ہے۔ جن ممالک میں فقہ مالکی اور فقہ شافعی رائج ہے وہ بھی امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عمل پیرا ہیں۔

مراکش میں فقہ مالکی کی حکومت ہے۔ وہاں بھی کسی کو یہ اجازت نہیں کہ حکومت کی مرضی کے بغیر جس غیر آباد زمین کو چاہے، آباد کر کے اپنی ملکیت میں شامل کر لے، حکومت کی اجازت وہاں بھی ضروری ہے۔ مصر میں جہاں فقہ شافعی کی اکثریت ہے، وہاں بھی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی مصری کاشت کار غیر آباد زمین کو آباد نہیں کر سکتا۔ وہاں بھی حکومت کی اجازت ضروری ہے۔ گویا عملاً دنیا نے امام ابوحنیفہ کے نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بطور بیان شریعت کے نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک اجازت تھی جو بطور سربراہ ریاست کے حضور نے دی تھی اور آئندہ جب کوئی سربراہ ریاست یہ اجازت دے گا یا حکومت کا متعلقہ محکمہ اس کی اجازت دے گا تو اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ یہ ایک مثال ہے اس اختلاف کی جو رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے بارے میں سامنے آیا۔

ایک اور مثال۔ جنگ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ سپاہیوں کو جوش دلانے کے لئے کبھی کبھی یہ اعلان فرمایا کرتے تھے:

من قتل قتیلا و له علیه سینة فله سلبه (۱۵)

اگر کسی دشمن کو قتل کر دو گے تو اس کا ساز و سامان قتل کرنے والے کا ہو جائے گا۔

سلب اس ذاتی ساز و سامان کو کہتے ہیں جو کسی سپاہی کے اپنے تصرف میں ہو۔ مثلاً اس کے جسم پر کوئی کپڑے ہیں، زیور ہے، زرہ ہے، تلوار اور دیگر ہتھیار ہیں، یہ چیزیں مال غنیمت میں شمار نہیں ہوں گی اور قتل کرنے والے مجاہد کی ہوں گی۔ اب من قتل قتیلاً و له علیه بینة فله سلبه کے بارے میں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے درمیان وہی اختلاف ہے جو مردہ زمین کی آبادکاری کے بارہ میں تھا۔ امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ یہ بات حضور نے بطور فوج کے کمانڈر کے فرمائی تھی۔ غالباً غزوہ بدر میں یہ بات ارشاد فرمائی۔ اس لئے جب اسلامی فوج کا کمانڈر میدان جنگ میں مناسب سمجھے تو ایسا حکم دے سکتا ہے۔ اور اس جنگ میں شرکت کرنے والے سپاہیوں کو اجازت ہوگی کہ اگر اسلامی فوج کا کوئی سپاہی دشمن فوج کے کسی سپاہی کو قتل کر دے تو اس کا ذاتی سامان قتل کرنے والے سپاہی کو دے دیا جائے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ فوج کے کماندار کا صوابدیدی اختیار ہے یا اس وقت کے سربراہ ریاست کا اختیار ہے۔ اگر وہ اس طرح کا کوئی عام حکم دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔

اس کے برعکس امام شافعی کے نزدیک یہاں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات بیان شریعت کے طور پر ارشاد فرمائی تھی۔ لہٰذا ہمیشہ ہر اسلامی جنگ میں، جہاں بھی مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ

ہورہی ہو اور جب کوئی غیر مسلم قتل کیا جائے گا تو جس مسلمان سپاہی کے ہاتھوں قتل کیا جائے گا اس کا ذاتی سامان اس مسلمان سپاہی کا حق ہے جس کی گولی یا تلوار سے وہ قتل ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں اگر امام شافعی اِس زمانے میں ہوتے تو وہ کیا فرماتے کہ اگر کوئی پائلٹ ایک بم مار کر دشمن کے پانچ سو سپاہیوں کو مار دے تو کیا ان تمام سپاہیوں کا سلب اس پائلٹ کو دے دیا جائے؟ یہ مجھے نہیں معلوم کہ آج کے شافعی فقہا اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی رائے البتہ آج بھی قابل عمل ہے کہ فوج کا کمانڈر جب بھی اور جہاں بھی اور جس حد تک مناسب سمجھے تو وہ یہ اجازت دے سکتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ امام مالک نے یہاں امام ابوحنیفہ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ امام مالک کا اصول اگر وہ ہے جو من احیاارضا میتةً میں تھا تو یہاں ان کی رائے امام شافعی کے ساتھ ہونی چاہئے تھی۔ اگر یہاں ان کی رائے امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہے تو وہاں بھی امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہونی چاہئے تھی۔ یہ بات مالکی فقہا نے نوٹ کی اور امام مالک کے اس نقطہ نظر کو درست ثابت کرنے کے لئے بہت لمبے چوڑے دلائل دیئے۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ امام مالک نے ایک جیسی بات میں دو رائیں کیوں اختیار فرمائیں۔

ایک اور چھوٹی سی مثال جب فتح مکہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ تو اسلام لانے والوں میں حضرت معاویہؓ کی والدہ ہند بنت عتبہ بھی شامل تھیں۔ ہند بنت عتبہ نے بہت سی دوسری خواتین کی معیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں حاضری دی۔ مختلف خواتین نے مختلف معاملات پر حضور سے مسائل اور سوالات پوچھے اور رہنمائی لی۔ ہند بنت عتبہ نے کہا:

یارسول اللہ!ان ابا سفیان رجل شحیح

بات ابوسفیان کی اہلیہ کہہ رہی ہیں اس لئے اس میں کسی صحابی کی غیبت کا پہلو نہیں ہے۔ میں اس کا لفظی ترجمہ کرتا ہوں کہ ابوسفیان انتہائی بخیل آدمی ہیں۔ پیسے پیسے کو بہت روک کر رکھتے ہیں۔ مجھے اور میرے بچوں کے ضروری اخراجات کے لئے بھی پورے پیسے نہیں دیتے تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حضور نے فرمایا:

خذی من مالہ مایکفیک ویکفی بینک بالمعروف (۱۶)

ان کے مال میں سے جتنا تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے کافی ہو وہ لے لیا کرو۔

یعنی شوہر کو بتائے بغیر ان کی جیب سے نکال لیا کرو۔ اس کی تمہیں اجازت ہے۔

اس موضوع پر فقہائے کرام کے درمیان طویل بحثیں ہوئیں۔ کچھ فقہائے کرام نے یہاں بھی یہ

رائے قائم کی کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے بطور بیان شریعت کے ارشاد فرمائی ہے۔ ابن حزم کی رائے یہی ہے کہ یہ بات بطور بیان شریعت کے ہے۔ اس لئے دنیا میں ہر بیوی کو بلکہ ہر اس شخص کے لئے جائز ہے کہ جس کا نفقہ کسی اور کے ذمہ ہو اور وہ نفقہ نہ دیتا ہو تو اس کی اجازت کے بغیر اپنا حق اس کے مال میں سے لے لے۔ مثلاً ایک ادارہ کسی ملازم کو تنخواہ نہ دے اور ملازم اپنے طور پر لینا شروع کر دے تو یہ بہت خطرناک بات ہو جائے گی۔ ابن حزم کی رائے میں بیویوں کو عام اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ شوہر کے مال میں سے اپنی ضروریات کے لئے ناگزیر اخراجات بغیر اجازت کے لے لیا کریں۔

کچھ حضرات کا اس بارے میں خیال ہے کہ یہ بات حضور نے بطور ایک قاضی کے ارشاد فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک شکایت سنی اور اس کی بنیاد پر آپ نے فیصلہ کیا۔ یہ رائے امام شافعی اور امام مالک کی ہے۔ لیکن اس پر احناف کی طرف سے پھر اعتراض ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے فریق کا موقف سنے بغیر کیسے فیصلہ فرما دیا۔ شافعی اور مالکی فقہا نے اس اعتراض کے مختلف جواب دیئے ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ذاتی طور پر ابوسفیان سے واقف تھے۔ اس لئے ان کا موقف سننے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ کیا قاضی اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک قاضی اپنی ذاتی معلومت کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فقہائے احناف کی رائے یہ ہے کہ اگر قاضی کو ذاتی طور پر معلوم ہو تو بھی وہ اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کرے گا۔ اس پر لمبی بحثیں ہیں۔

پھر اس پر فقہائے شافعیہ نے ایک اصول نکالا، ظفر بالحق۔ فقہائے احناف اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کا کوئی حق کسی کے ذمہ واجب الادا ہو اور وہ دیتا نہ ہو اور اتفاق سے حق دار کو وہ رقم مل جائے، تو امام مالک کے نزدیک جائز ہے کہ وہ اپنا حق وصول کرے۔ امام مالک کے پورے احترام کے باوجود واقعے یہ ہے کہ آج اگر اس پر عمل درآمد ہونے لگے تو بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ امام ابوحنیفہ اس پورے واقعہ کی تعبیر اور تفسیر یہ کرتے ہیں کہ یہ ایک عام مشورہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے خاندان کے ایک بزرگ کے طور پر دیا۔ ابوسفیان کے خاندان سے حضور کی رشتہ داریاں تھیں اور آپ ﷺ اس خاندان کے لوگوں سے فرداً فرداً ذاتی طور پر واقف تھے۔ خاندان کا بزرگ ہی ایسے ذاتی امور میں مشورہ دے سکتا ہے۔ حضور کو یقین تھا کہ ابوسفیان اس کو محسوس نہیں کریں گے۔ جب ان کو پتہ چلے گا کہ حضور نے یہ مشورہ دیا ہے تو وہ خوشی سے اس کو قبول کریں گے۔ اس لئے یہ ایک بزرگانہ اور خاندانی مشورہ تھا۔ جس طرح ایک بھائی بہن سے کہے کہ تم بقدر ضرورت لے لیا کرو، اور اس کو یقین

ہو کہ بہن کا شوہر اس پر اعتراض نہیں کرے گا۔

یہ چند وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف رہا ہے کہ ان پر کیسے عمل درآمد کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں ملت ابراہیمی کے بقایا جات کے نام سے فقہیات سیرت کے ایک نئے پہلو پر توجہ دی ہے۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مسلمانوں کو روحانی باپ کہا گیا ہے۔

ملت ابیکم ابراھیم (۱۷)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیشہ اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیرو قرار دیا ہے۔ ملت ابراہیمی کے پیروکار ہونے سے کیا مراد ہے؟۔ اس پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ بحث کی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ بحث قابل دید ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یوں تو تمام انبیا علیہم السلام کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی ایک تمہید تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے لئے ایک فوری مقدمہ یا فوری ارہاص یا تمہید کی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی مرتبہ ایک بین الاقوامی ملت پیدا کی۔ وہ پہلے پیغمبر تھے جنہوں نے مختلف اقوام میں دین کی تعلیم دی۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ واحد نبی ہیں جن کی بعثت مختلف اقوام کے لئے ہوئی۔ جنہوں نے عراق، شام، فلسطین، مصر اور جزیرہ عرب میں تبلیغ کے فرائض سرانجام دیئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام روم بھی تشریف لے گئے۔ بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آپ ہندوستان بھی تشریف لائے۔ لیکن یہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ وہ بین الاقوامی مشن رکھنے والے پہلے پیغمبر ہیں اور اس بین الاقوامیت کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی ملت بعض ایسے اساسات پر قائم ہو جو انسانی فطرت کے قریب تر ہوں۔ انسانی فطرت سلیمہ ان کو تسلیم کرتی ہو۔ ان اساسات کا اعتراف کرتی ہو اور ان کی بنیاد پر جو عالمگیر تہذیب قائم کی جائے وہ تمام انسانوں کے درمیان ایک مشترک تہذیب کے طور پر پنپ سکتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیرو قرار دیا۔ ملت ابراہیمی کا مرکز بیت اللہ روز اول سے ہی چلا آ رہا تھا۔ حج حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شروع کیا۔ حج کے تمام احکام اور طریقے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اور حضور کے زمانے تک چلے آ رہے تھے اور ان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بیت اللہ کا طواف، بیت اللہ کی حرمت، حجاج کرام اور عمرے کے

لئے آنے والوں کا اللہ کے نام پر قربانی دینا، صفا اور مروہ کے درمیان سعی، منیٰ کا قیام، عرفات کا اجتماع، یہ ساری وہ عبادات تھیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ ان میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو جاہلیت کے زمانے میں کچھ عربوں نے چھوڑ دی تھیں تو ان کو رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ بحال کرادیا۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں جو بعض لوگوں نے جاہلیت کے دور میں شرارت یا جہالت سے حج میں شامل کردی تھیں وہ حضور نے نکال دیں، اور حج کی عبادت کو پاکیزہ اور منقح کر کے دوبارہ ملت ابراہیمی کے مطابق قائم کردیا۔ یہ ساری تفصیل جاننا اس لئے ضروری ہے کہ جب شریعت کے احکام کی بنیاد پر کوئی عالمگیر ملت یا معاشرہ قائم کیا جائے گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوڑے ہوئے اصول اور آپ کی دی ہوئی ملت کے آثار و بقایا جات اس کی بنیاد ہوں گے اور ان کی بنیاد پر ہی یہ تہذیب قائم کی جائے گی۔

جو چیزیں عرب لوگ ناپسند کرنے لگے تھے ان کی ناپسندیدگی کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک ایک کر کے ختم کردیا۔ مثال کے طور پر منیٰ میں شروع سے میلہ اور بازار لگا کرتا تھا۔ باہر سے آنے والے قبائل اپنا سامان لاکر وہاں بیچا کرتے تھے۔ یہ چیز قریش اور طائف کی تجارت کو نقصان پہنچاتی تھی۔ قریش کے بعض بڑے بڑے ساہوکاروں کا خیال تھا کہ منیٰ کے بازار سے قریش کے تجارتی مفاد پر زد پڑتی ہے۔ بجائے اس کے کہ تجارت قریش کے ہاتھ میں ہو، منیٰ کے بازار کے ذریعے تجارت کا ایک بڑا حصہ ان قبائل کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا جو اپنا سامان لاکر منیٰ میں بیچا کرتے تھے۔ اس لئے قریش نے یہ چاہا کہ دوسرے قبائل کو تجارتی سرگرمیوں سے روکنے کی خاطر یہ تصور پیدا کریں کہ حج تو ایک خالص روحانی عبادت اور پاکیزہ چیز ہے۔ اس میں دنیاوی تجارت اور مادیات کی الائش نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے قبائل کو تجارت سے روکنا چاہا۔ رسول اللہ ﷺ نے تجارت کی نہ صرف اجازت دی بلکہ قرآن پاک میں ہدایت کی گئی کہ اللہ کی عبادت بھی کرو اور اس کا فضل بھی تلاش کرو۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان حج کے موقع پر تجارت کرنا چاہتا ہے تو یہ حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کے بالکل مطابق ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ دینی سرگرمیوں کے دوران دنیاوی سرگرمیاں ہوسکتی ہیں اور دنیاوی سرگرمیوں کو دین کی رہنمائی میں کرنا نہ صرف جائز بلکہ عبادت ہے، اس لئے حضور نے ان سرگرمیوں کو بحال کردیا۔

قریش مکہ نے اپنے آپ کو عرب کے دوسرے حجاج سے ممیز کرنے کے لئے یہ طے کیا کہ ہم حج کے فلاں اور فلاں مناسک میں شریک نہیں ہوں گے۔ مثلاً ہم مزدلفہ میں رات نہیں گزاریں گے۔ آخر عرب

کے بدوؤں اور عام لوگوں کے ساتھ ہم کیسے رات گزاریں۔ یوں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے خود مزدلفہ سے مستثنیٰ کرلیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ کے قیام کو نہ صرف دوبارہ بحال کر دیا بلکہ مزدلفہ کے قیام کو ضروری قرار دیا۔

اسی طرح سے قربانی اور دوسری کئی عبادات کے بارے میں جو غلط فہمیاں رائج تھیں وہ حضور ﷺ نے دور فرمائیں اور ایک ایک کر کے دوبارہ ملت ابراہیمی کے احکام کو زندہ کیا۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے ایک اور اہم چیز بیان کی ہے کہ شریعت کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ احکام الٰہی کی اطاعت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ اس میں جو رکاوٹیں ہوں ان کو دور کیا جائے۔ اسی طرح جو رسوم ورواج کسی قوم میں مروج ہیں ان رسوم ورواج کے مثبت پہلوؤں کو اسلام کی تہذیب میں سمویا جائے اور ان میں جو منفی پہلو ہیں ان کو پاک صاف کیا جائے اور اس طرح ایک ایسی عالمگیر اور بین الاقوامی برادری قائم کی جائے جس میں ہر قوم کے احساسات، پسند ناپسند اور انسانی اقدار کی ترجمانی ہو۔ بشرطیکہ کہ ان کی اساس ملت ابراہیمی پر ہو اور وہ شریعت کے احکام کی روشنی میں طے کی گئی ہوں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب نے جاہلیت کی عادات کا بھی مطالعہ کیا اور یہ ہدایت کی کہ سیرت کے ہر طالب علم کو اور حکمت شریعت کے جویا کو عہد جاہلیت کا مطالعہ کرنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہاں بنو اسماعیل میں ملت ابراہیمی کی جو وراثت چلی آرہی تھی اس کے بنیادی عناصر کیا تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں ان میں کون کون سی چیزیں بطور بدعات شامل کی گئیں۔ کون کون سی خرافات شامل ہوئیں اور کس طرح سے ملت ابراہیمی کے احکام میں تحریفات شامل ہوئیں۔

فقہیات سیرت پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے ایک دو مزید چھوٹی چھوٹی چیزیں مثال کے طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شریعت کا ایک اصول ہے جس کو احراز اور استیلاء کے نام سے بعض فقہا نے بیان کیا ہے۔ اس معاملے میں بھی امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر کئی دوسرے فقہا کے نقطہ نظر سے مختلف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ میدان جنگ میں اگر دشمن فوج کا سپاہی مسلمانوں کی کسی چیز پر قابض ہو جائے اور اس کو کامیابی کے ساتھ میدان جنگ اور مسلمانوں کے علاقوں سے نکال کر اپنے علاقے میں لے جائے تو وہ اس کا مالک سمجھا جائے گا اور مسلمان کی ملکیت اس پر ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح سے اگر کوئی مسلمان سپاہی دشمن کی کسی چیز کو اپنے قبضے میں لے کر کامیابی کے ساتھ اس کو اسلامی ریاست کی حدود میں لے آئے تو اس چیز پر سے اس غیر مسلم کا قبضہ بھی ختم ہو جائے گا اور ملکیت بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ اصول امام ابوحنیفہ نے سب سے پہلے دریافت فرمایا جس کو فقہائے احناف نے احراز کے نام سے بیان کیا۔

امام ابوحنیفہ اس اصول کو سیرت کے کئی واقعات سے ثابت کرتے ہیں۔ان کا سب سے بڑا استدلال فتح مکہ کے واقعات سے ہے۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ اپنے سابقہ دولت کدے پر قیام فرمانہ ہوئے۔ نہ آپ ﷺ نے اپنی جائداد کا قبضہ دوبارہ لینے کی کوشش کی۔ جو جائداد جس کے قبضے میں تھی اسی کے قبضے میں رہی۔حضور نے اپنا مکان مبارک جو حضرت علیؓ کے بھائی جناب عقیل ابن ابی طالب نے بلا اجازت فروخت کر دیا تھا، نہ صرف واپس نہیں لیا، بلکہ حضور ﷺ نے حضرت عقیل سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم نے میرا مکان کیوں فروخت کیا۔جس کے ہاتھ فروخت کیا تھا اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے ایک ناجائز طریقے سے میرا مکان کیوں خریدا۔غرض جو جائیداد جس کے پاس تھی اسی کے پاس رہی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی میں بقیہ صحابہ کرام نے بھی اپنی اپنی جائدادوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا۔وہ جائداد پھر انہی لوگوں کی قرار پائی جو اس پر قابض تھے۔مورخین اور سیرت نگاروں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس نے کس کی جائداد پر قبضہ کیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مہاجر صحابہ کرام میں سے کچھ صحابہ کرام تو اپنی جائداد کی چابیاں اپنے کسی دوست کو دے آئے تھے۔ان دوست نے جایداد پر خود قبضہ کرلیا یا اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔اکا دکا صورتوں میں امانت کی حفاظت بھی کی گئی اور جب اصل مالکان مکہ آئے تو ان کی جائیداد واپس کر دی گئی۔ لیکن یہ واقعات بہت شاذ و نادر ہی ہوئے ہیں۔اکثر صورتوں میں وہ جائدادیں ہاتھ سے چلی گئیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو واپس لینے کی کوشش نہیں کی۔امام ابوحنیفہ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر کسی دشمن ملک کا شہری کسی اسلامی ملک کے مسلمان شہری کی جائداد پر قبضہ کرلے تو وہ جائداد اس قابض ہی کی سمجھی جائے گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ جائدادیں ان غیر مسلموں کی نہ ہوگئی ہوتیں جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے تو رسول اللہ ﷺ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ناجائز جائداد کا برقرار رہنا پسند نہ فرماتے اور اس کو تلقین فرماتے کہ تمہارے قبضہ میں یہ جائداد ناجائز ہے۔حضور کا اس پر اعتراض نہ کرنا اور مسلمان ہونے کے باوجود انہی ہاتھوں میں اس جائیداد کا رہنا اور بعد میں ان کا اس میں اپنی جائداد کی طرح تصرف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور نے ان کی اس ملکیت کو درست تسلیم کیا۔ جب حضور نے ملکیت کو درست تسلیم کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ احراز کی بنیاد پر ملکیت مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ غیر مسلم دشمن کے لئے ہے جو حالت جنگ میں ہو۔

دوسرے فقہا بالخصوص امام شافعی اور امام مالک اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ان کے نزدیک اس

اصول پر عملدرآمد سے بہت قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مالکی اور شافعی فقہا نے بہت شد و مد سے ان قباحتوں کا ذکر کیا ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن یہ احراز کا اصول ہے جس سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کر کے اس اصول کو بیان کیا ہے۔

ایک اور اہم بات جو فقہیات سیرت سے متعلق ہے جس کے بارے میں فقہائے اسلام نے بڑی بحثیں کی ہیں وہ جزیے کا حکم ہے۔ ان بحثوں میں کئی چیزیں ایسی بھی آگئیں جن کی وجہ سے غیر مسلموں کو مسلمان امت کے بارے میں بہت سی منفی اور بے سروپا باتیں کہنے کا موقع ملا۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ غیر مسلموں سے شہریت کا معاہدہ اس شرط پر کیا جاسکتا ہے کہ وہ جزیہ اور ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار ہو،

حتی یعطوا الجزیۃعن یدوھم صاغرون (۱۸)

جزیے کے لفظی معنی بدلے اور consideration کے ہیں، یعنی غیر مسلموں سے شہریت کا معاہدہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب وہ حفاظتی ٹیکس یا شہریت کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جس طرح مسلمان زکوٰۃ یا عشر ادا کرتا ہے، اسی طرح غیر مسلم خراج ادا کرتا ہے۔ مسلمان سے زکوٰۃ لی جاتی ہے جو ناقابل تغیر اور تبدل ہے۔ غیر مسلم سے جزیہ لیا جاتا ہے جس کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے اور کمی بھی کی جاسکتی ہے۔ مسلمان سے زرعی پیداوار پر عشر لیا جاتا ہے جبکہ غیر مسلم سے خراج لیا جاتا ہے۔ خراج معاف بھی ہوسکتا ہے لیکن عشر معاف نہیں ہوسکتا۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ عشر، زکوٰۃ، خراج اور جزیے کے معاملے میں غیر مسلموں کی حالت مسلمانوں کی نسبت بہتر ہے، کیونکہ بعض صورتوں میں وہ اس سے مستثنیٰ بھی ہیں اور بعض صورتوں میں مکمل معافی اور کمی کے بھی مستحق ہیں۔ جبکہ مسلمان نہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہے اور نہ ہی اس کی تخفیف ہوسکتی ہے۔

اس سیاق وسباق میں قرآن میں آیا ہے کہ حتی **یعطوا الجزیۃ وھم صاغرون**، یہاں **صاغرون** سے کیا مراد ہے۔ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ وہ چھوٹے ہو کر جزیہ دیں۔ چھوٹے ہونے سے کیا مراد ہے۔ اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئی ہیں اور بعض فقہا نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جن کی وجہ سے بعض غیر مسلموں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم دوسرے درجے کے شہری ہوتے ہیں۔ امام شافعی نے اس کی بڑی فاضلانہ اور معقول تعبیر کی ہے اور کتاب الام میں لکھا ہے کہ **والصغار ان یجری علیھم حکم اللہ**، صغار سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم یعنی قانون کی بالادستی قبول کرلیں۔ شریعت کی بالادستی قبول کرنے کے بعد اسلامی ریاست کے دستور کو برتر قانون ماننے کے بعد وہ ریاست میں برابر کے شہری قبول

کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ وہ ریاست کے مالی تقاضے اور ضروریات اسی طرح ادا کریں جیسے مسلمان ادا کرتے ہیں۔اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے غیر مسلموں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جائے۔

یہ وہ چند مسائل تھے جو فقہیات سیرت سے تعلق رکھتے ہیں۔فقہیات سیرت میں فقہائے اسلام نے رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کے بارے میں بھی بحث کی ہے۔کیا رسول اللہ اجتہاد فرماتے تھے؟ بعض فقہا کا خیال ہے کہ حضور اجتہاد نہیں فرماتے تھے۔ان حضرات کی رائے میں اجتہاد کا حکم غیر نبی کے لئے ہے۔نبی تو صاحب شریعت اور حامل وحی ہے، اس لئے نبی کو اجتہاد کی کیا ضرورت ہے۔اس کے برعکس بعض فقہا کا خیال ہے کہ جن معاملات میں واضح رہنمائی نہیں ہوتی تھی حضور ﷺ ان معاملات میں اجتہاد فرماتے تھے۔چونکہ آپ کا اجتہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے محفوظ و مامون تھا اس لئے وہ بھی وحی کی ایک قسم تھا۔بعض لوگوں نے اس کے لئے اجتہاد کے بجائے ملکہ نبوت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔بعض افراد نے اس کے لئے فہم نبوی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔وہ اجتہاد نبوی ہو، فہم نبوی ہو یا فہم رسالت ہو، بہر صورت یہ وہ چیز ہے جو رسول اللہ ﷺ اپنی دانست اور بصیرت سے ارشاد فرماتے تھے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شریعت کی فہم میں جو غیر معمولی ملکہ حاصل ہوگا اس کا اندازہ ہم سب کر سکتے ہیں۔اس کی روشنی میں حضور بعض معاملات کا فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ایک دو مواقع پر ایسا ہوا کہ حضور نے ایک چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا اور قرآن پاک میں اس کے بارے میں تھوڑا سا اختلافی حکم آ گیا۔اس حد تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ بعد میں بدل گیا، لیکن اکثر و بیشتر ایک آدھ مواقع کے علاوہ حضور نے جو فیصلہ کیا، قرآن پاک نے اسی کی تائید کی اور اسی کے مطابق قوانین شریعت بعد میں مرتب ہوئے اور تیار ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ النجم:۴

۲۔ مسلم/داراحیاء التراث العربی، بیروت: ج۴،ص۱۸۳۶،رقم ۲۳۶۳

۳۔ ترمذی/داراحیاء التراث العربی، بیروت: ج۴،ص۳۸۳،رقم ۲۰۳۸

۴۔ ہیثمی/مجمع الزوائد: دارالکتاب العربی، بیروت: ج۴،ص۱۵

۵۔ نمل:۲۴

۶۔ روم:۳۹

۷۔ البقرہ:۱۸۵

۸۔ بخاری/دار ابن کثیر، بیروت: ج ۳، ص ۱۱۰۴، رقم ۲۸۷۳

۹۔ الاعراف: ۱۵۷

۱۰۔ المائدہ: ۴

۱۱۔ بخاری: ج ۵، ص ۲۰۶۰، رقم ۵۰۷۶

۱۲۔ مسلم: ج ۳، ص ۱۵۴۵، رقم ۱۹۴۸ء

۱۳۔ الطبری/التاریخ/دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۷ھ: ج ۲، ص ۲۹

۱۴۔ ترمذی/السنن/دار احیاء التراث العربی، بیروت: ج ۳، ص ۶۶۲، رقم ۱۳۷۸

۱۵۔ بخاری: ج ۴، ص ۱۵۷۰، رقم ۴۰۶۶

۱۶۔ مسلم: ج ۳، ص ۱۳۳۸، رقم ۱۷۱۴

۱۷۔ حج: ۷۸

۱۸۔ التوبہ: ۲۹

مطبوعات کتب خانہ سیرت

رسول اکرم ﷺ بہ حیثیت تاجر
مرتب: حافظ محمد عارف گھانچی

سیرت سید الکونین ﷺ
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ

رسول اکرم ﷺ بہ حیثیت والد
مرتب: حافظ محمد عارف گھانچی

خطباتِ سیرت ﷺ
ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

کھتری مسجد، لی مبارکیٹ، کراچی۔
فون: ۲۵۴۱۹۵۱، موبائل: ۰۳۲۱_۲۸۳۴۲۴۹
تقسیم کار: مکتبہ فیض القرآن، ۱۲ قاسم سینٹر، اردو بازار، کراچی: فون ۲۲۱۷۷۷۶